Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1965

پاکستان کا معمارِ اول

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

پاک و ہند سے

سالانہ ——— دس روپے

غیر ممالک سے

سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون نمبر (۸۰۸۰۰)

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

جلد ۱۸ | جون سنہ ۱۹۶۵ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

لمعات ——— ۲
حرفِ دل ——— (نظم سید احمد حناں) ——— ۸
۲۲ مئی ۱۹۶۵ء ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۹
مدرسۂ علی گڑھ سے دانشگاہِ قرآنی تک ——— (صفدر سلیمی) ——— ۳۸
دین و دنیا کا حسین امتزاج ——— ۴۲
بچوں کا صفحہ ——— ۴۶
ہندو کا علاج یہی ہے ——— ۴۹
انشاء اللہ ——— (سر سید احمد خاں) ——— ۵۷
رابطۂ باہمی ——— ۶۱
ملی یکجہتی کیونکر پیدا ہو! ——— (محترم فقیر بخش بگٹی) ——— ۶۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غالب نے کہا تھا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ہم نے اس کپڑے کو تو نہیں دیکھا جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا لکھا ہو۔ کیونکہ اب چاک گریباں عشاق کا زمانہ نہیں رہا۔ لیکن ہم نے ایک چیز اور دیکھی ہے۔ جس کی قسمت عاشق کے گریبان سے بھی بدتر ہے۔ اور وہ ہے پاکستان میں قانون سازی کا مسئلہ۔ اس اٹھارہ سال میں جس بری طرح سے اس کی دھجیاں بکھیری ہیں، وہ عبرت اور موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس ملک نے جو یہ اعلان کر دیا کہ ہم یہاں اسلامی قانون نافذ کریں گے، تو یہ گویا اتنا بڑا جرم تھا جس کی پاداش میں قوم ایسی سزا بھگت رہی ہے جس کی نظیر شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ کسی قوم کی اس سے بڑی سزا اور کیا ہوگی کہ اس کے امور اجتماعی کے سینے پر ملا کا کابوس سوار ہو جائے جو اسے بڑھنے، پھولنے کی تو ایک طرف اپنے جلنے کی بھی اجازت نہ دے۔ آئیے آج کی نشست میں دیکھیں کہ اسلامی قوانین کی تدوین کی اصل پوزیشن کیا ہے۔ اور ہماری قدامت پرست مذہبی پیشوائیت اس کے راستے میں کس طرح حائل ہو رہی ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اسلامی قوانین اپنی منزہ اور صحیح شکل میں عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں نافذ اور رائج تھے۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ قانون کی تدوین حکومت کی ذمہ داری تھی۔ اس کے لئے کوئی اور گوشہ نہیں تھا جس کی طرف حکومت کو رجوع کرنا پڑے، چہ جائے کہ اسے حکومت سے بھی برتر قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوں۔

دوسری بات اس دور میں یہ نظر آئے گی کہ وہاں پبلک لاز اور پرسنل لاز میں کوئی تفریق نہ تھی۔ اُمت کی پبلک اور پرسنل زندگی ایک تھی اس لئے قوانین میں اس قسم کی تمیز و تفریق کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

تیسری بات یہ تھی کہ پوری کی پوری اُمت ایک جمعیت تھی جس میں کوئی فرقہ نہیں تھا اس لئے ایک ہی قانون تمام اُمت پر نافذ ہوتا تھا۔ چونکہ اُمت میں مختلف فرقے نہیں تھے اس لئے مختلف فرقوں کے لئے مختلف قوانین کا تصور بھی نہیں تھا۔

یہ تھی پوزیشن اس عہد سعادت مہد میں اسلامی قوانین کی۔ آپ ان علمائے کرام سے پوچھئے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ درست ہے یا اس میں کوئی غلطی ہے؟

۳۔ اُس دور کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو دین دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور اس طرح سیاست اور مذہب کی غیر اسلامی ثنویت مسلمانوں کا شعار بن گئی۔ پبلک لاز (یعنی امور سیاست سے متعلق قوانین) حکومت کے زیر اقتدار آ گئے اور پرسنل لاز علماء کی تفویض میں دے دیئے گئے۔ ملوکیت اس کا نام نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا اس کا جانشین ہو جائے۔ اگر اس باپ کا بیٹا اسلامی طریق پر امیر امت منتخب کر لیا جائے اور وہ دین کی وحدت کو برقرار رکھے (یعنی اسے سیاست اور مذہب میں تقسیم نہ کر دے) تو اس کی حکومت خلافت ہی کہلائے گی اگر وہ ایسی ثنویت پیدا کر دے یا اسے برقرار رکھے تو اسے ملوکیت کہیں گے۔ خواہ اس کا انتخاب اُمت کی مشاورت سے ہوا ہو اور ذاتی طور پر وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو۔

مذہب اور سیاست کی یہ ثنویت مسلمانوں کی ملوکیت کے زمانے میں بھی قائم رہی۔ اور ہندوستان میں اسے انگریزوں نے بھی برقرار رکھا۔ اس طرح بیک وقت دو متوازی حکومتیں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ تا آنکہ پاکستان وجود میں آ گیا جب پرسنل لاز علماء کی تفویض میں دے دیئے گئے اور اس طرح انہیں متوازی اقتدار حاصل ہو گیا تو ہوس اقتدار نے ان میں گروہ سازی کا جذبہ پیدا کیا اس طرح مختلف قوموں کے پرسنل لاز مختلف ہو گئے۔ اور یوں "حکومت" کے اس دائرے کے اندر الگ الگ ریاستیں قائم ہو گئیں۔

ہمارے علماء کا طبقہ اسی ثنویت کو اسلام قرار دے کر اس پر جم کر بیٹھا ہے اور کسی صورت میں اسے مٹنے نہیں دینا چاہتا، اس لئے کہ اس تصور کے مٹ جانے سے ان کی متوازی حکومت ختم ہو جاتی ہے اور فرقے نہ رہنے سے ان کی الگ الگ ریاستیں باقی نہیں رہتیں۔

۴۔ ظاہر ہے کہ اسلامی قوانین کا یہ تصور نہ خدا کی کتاب کے مطابق ہے نہ سُنّت رسول اللہ کے مطابق۔ یہ ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار اور یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کو اس پر اصرار ہے کہ اس تصور کو عین اسلامی سمجھا جائے اور پاکستان میں عملاً مستحکم کیا جائے۔ یہ ہے اصلی وجہ اس ساری کشمکش کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں قانون سازی کا مسئلہ "عاشق کا گریباں" بن رہا ہے اور اس کی رفوگری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اس کی بین مثال ہمارے سامنے ہے۔ پرسنل لاز میں عائلی قوانین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے دور ملوکیت کے وقت سے یہ قوانین علماء کے "حیطۂ مملکت" میں چلے آ رہے تھے۔ پاکستان میں اس امر کی کوشش کی گئی کہ انہیں اس حیطہ سے نکال کر (اسلامی تصور کے مطابق) حکومت وقت کے دائرۂ اقتدار میں دوبارہ لے آیا جائے۔ آپ نے دیکھا کہ اس پر علماء کی طرف سے کس قدر کہرام مچایا گیا ــــ اور اب تک مچایا جا رہا ہے۔ ان قوانین میں کوئی شق ایسی نہیں جسے ا

کے خلاف کہا جاسکے بلکہ یہ مروجہ قوانین شریعت کے مقابلہ میں قرآن کریم سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی مخالفت صرف اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ یہ علماء کی متوازی حکومت کو ختم کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی فرق نہیں اور دونوں کا مرکز نظام مملکت ہے تو ان کا اقتدار باقی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے ان کی پہلی کوشش آئین پاکستان (۱۹۶۲ء) میں ترمیم تھی۔ اصلی آئین میں یہ شق درج تھی کہ ملک میں کوئی قانون "اسلام" کے خلاف نافذ نہیں ہوگا۔ اور اس میں مختلف فرقوں کے وجود کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ان حضرات کے انتشار پھیلانے سے جو ترمیم کی گئی اس میں کہا گیا کہ ملک میں کوئی قانون کتاب و سُنّت کے خلاف نہیں ہوگا اور ہر فرقہ کو اجازت ہوگی کہ وہ کتاب و سنّت کی تعبیر اپنی فقہ کے مطابق کرے۔ آپ نے غور کیا کہ اس ترمیم کی رُو سے اس آئین کو جو اسلامی نظام کے صحیح تصور کی طرف قدم بڑھانے کی فکر کر رہا تھا، کس طرح دورِ ملوکیت کے پیدا کردہ اسلام کی طرف لوٹا دیا گیا۔ اور اس کا نام رکھ دیا گیا "اتباعِ کتاب و سُنّت"۔ ہمارے دورِ ملوکیت میں ہوتا یہی رہا ہے، کتنی باتیں "خلاف کتاب و سنت" ہیں جنہیں کتاب و سنت کا نقاب اوڑھا کر شریعت بنا دیا گیا۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ علماء کی طرف سے عائلی قوانین کی مخالفت اس لئے ہو رہی ہے کہ اس اصول کے تسلیم کرنے سے انکا اقتدار خطرے میں پڑ جاتا ہے، اس کا بھی بین ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت متعدد قوانین ایسے ہیں جن کے خلافِ کتاب و سُنّت ہونے میں دو آراء ہی نہیں ہو سکتیں —— مثلاً غیر شادی شدہ عورت کی رضامندی سے زنا جرم نہیں، اور شادی شدہ عورت سے زنا بھی اسوقت جرم ہے جب اس کا خاوند اس کے خلاف شکایت کرے۔ یہ اور اس قسم کے کئی ایک قوانین خلافِ کتاب و سُنّت ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی یہ سنا بھی کہ علماء کرام نے ان قوانین کی تنسیخ و ترمیم کے لئے وہ کچھ کیا ہو جو کچھ یہ عائلی قوانین کی تنسیخ کے لئے کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ قوانین پبلک لاز کی فہرست میں شامل ہیں اسلئے وہ جیسے بھی ہوں ہوا کریں۔ علماء کے حیطۂ اقتدار پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن عائلی قوانین ان حضرات کے دائرے کی چیز ہے۔ اسلئے یہ اس میں حکومت کی مداخلت گوارا نہیں کر سکتے۔ اس مخالفت کی اصلی وجہ یہ ہے اور اسے نام دیا جا رہا ہے کتاب و سنت کی حمایت کا۔

۵۔ پاکستان میں طلوع اسلام نے یہ آواز بلند کی کہ سیاسی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کی متوازی حکومتوں کا یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اس لئے جس مملکت کو ہم نے صحیح اسلامی قوانین اور اقدار کی تنفیذ کے لئے حاصل کیا ہے اس میں اس ثنویت کو ختم کرنا چاہیئے۔ اس آواز کا جو اثر ہماری مذہبی پیشوائیت پر پڑ سکتا ہے وہ بدیہی ہے۔ لہٰذا انہوں نے طلوع اسلام کی مخالفت میں متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ جو بات طلوع اسلام کہتا ہے یہ حضرات اس کی تردید کر نہیں سکتے اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت میں وہی حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا جسے یہ حضرات اپنے مخالف کے خلاف بالعموم استعمال کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے طلوع اسلام کے خلاف بے بنیاد الزامات تراشے۔ اور پھر ان الزامات

کی بنیادوں پر اسے منکرِ خدا، منکرِ رسالت، تین نمازیں، نو دن کے روزے، اردو میں نماز وغیرہ کا مدعی قرار دے کر کفر و ارتداد کے فتاویٰ صادر کر دیئے۔ اور چونکہ اس مخالفت میں تمام فرقوں کے علماء شامل تھے ــــ جو بات طلوعِ اسلام کہتا تھا اس کی زد کسی خاص فرقے پر نہیں بلکہ علماء کے ادارہ (INSTITUTION) پر پڑتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس مخالفت کو ملک گیر بنا دیا ــــ ٹھیک ہے جس ... [illegible] ... ست اختر زلل ہو رہی ہو وہ کیوں نہ ایسا کرے؟ لیکن طلوعِ اسلام کو اس کا کوئی غم نہیں۔ اس کی مخالفت نہ کسی خاص فرقے سے ہے۔ نہ کسی فرد یا افراد کے گروہ سے۔ اس کی مخالفت اس غیر اسلامی تصور سے ہے جسے یہ حضرات اپنی مفاد پرستی کی خاطر، پاکستان میں محکم کرنا چاہتے ہیں ــــ یعنی مذہب اور سیاست کی ثنویت۔ پبلک اور پرسنل لاز کی تمیز۔ اگر یہ حضرات اس بات کو ثابت کر دیں کہ عہدِ نبی اکرمؐ و خلافتِ راشدہ میں۔

(۱) پبلک لاز اور پرسنل لاز میں تفریق تھی۔ اور

(۲) اُمت میں مختلف فرقے موجود تھے اور ہر فرقہ کا پرسنل لاء الگ تھا۔

تو طلوعِ اسلام اس باب میں آج ہی ان کی مخالفت چھوڑ دے گا۔ اور اگر حقیقت یہی ہے کہ یہ چیزیں بعد کی ایجاد ہیں اور خلافِ کتاب و سنت۔ تو طلوعِ اسلام اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قوم کے سامنے صحیح اسلامی نظام کا تصور پیش کرتا جائے۔

۲۔ ان حضرات کی طرف سے یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ کیا ہم اسلامی قوانین سازی کا کام ان لوگوں کے سپرد کر دیں جن کی زندگی فسق و فجور میں گزرتی ہے اور جنہیں علومِ اسلامی کی ہوا تک نہیں لگی؟

جہاں تک فسق و فجور کا تعلق ہے ان حضرات کا ادعا یہ ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری ساری کی ساری مولوی صاحبان میں سمٹ آئی ہے اور ان سے باہر ساری اُمت فاسق و فاجر ہے۔ اس ضمن میں وہ کچھ رعایت دیتے ہیں تو ان لوگوں کو جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں یا صدقہ و خیرات سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ نیز ان حضرات کی زندگی میں ان کے اس ادعا کا جو وزن ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ دو بھائیوں میں سے ایک گورنمنٹ کالج میں داخل ہو جاتا ہے اور دوسرا کسی مذہبی مکتب میں۔ کیا اس کے بعد آپ باور کریں گے کہ گورنمنٹ کالج کا طالبِ علم بالضرور ملحد و بے دین یا فاسق و فاجر ہو گا۔ اور مکتب کا فارغ التحصیل، محض وہاں کا طالبِ علم ہونے کی بنا پر متقی و پرہیزگار؟ اسے بھی چھوڑیئے۔ آپ ان حضرات سے پوچھیئے کہ اگر ملک کے غیر مولوی طبقہ کی زندگی اسلام پر پوری نہیں اترتی تو کیا یہ اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے طبقہ کی زندگی صحابہ جیسی ہے؟ ہمارے معاشرے میں بھلائیاں اور برائیاں مخلوط ہیں۔ نہ کسی طبقے کے متعلق آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساری برائیاں اسی میں سمٹ آئی ہیں، نہ کسی دوسرے کے متعلق یہ کہ وہ ساری بھلائیوں کا مجموعہ ہے۔

باقی رہا علومِ اسلامی سے واقفیت کا سوال۔ سو اس کے متعلق یہ ادعا کہ یہ صرف انہی حضرات کی اجارہ داری ہے

خالص برہمنیت ہے۔ یہ علوم شاستروں کی طرح گیت وید نہیں۔ یہ کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہر ایک کے سامنے ہیں جس کا جی چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ حضرات اسے تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ اس کی ایک بین مثال ہمارے سامنے ہے (طلوع اسلام شخصیتوں کا ذکر بالعموم نہیں کرتا۔ لیکن بعض اوقات ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ مثال بھی ایسی ناگزیر کیفیت کی مظہر ہے) ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور اس جہت سے اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب سے بعض امور میں اختلاف ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں فقہ و حدیث کا جس قدر علم حاصل ہے وہ ان حضرات سے اگر زیادہ نہیں تو ان سے کسی صورت میں کم بھی نہیں۔ لیکن چونکہ وہ "مولوی فضل الرحمٰن" نہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ہیں اس لئے یہ حضرات ان کے پیچھے لٹھ لئے پھر رہے ہیں اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور مشاورتی کونسل میں ان کا وجود انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس کے برعکس محترم علاؤالدین صدیقی صاحب مشاورتی کونسل کے صدر ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ انہیں بھی اسکا اعتراف ہوگا کہ ان کے مقابلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب علوم اسلامی (فقہ، حدیث، کلام وغیرہ) سے کہیں زیادہ واقف ہیں لیکن چونکہ وہ مسٹر یا ڈاکٹر نہیں کہلاتے (وہ ڈاکٹر ہیں بھی نہیں) علامہ کہلاتے ہیں (حالانکہ "علامہ" کی اصطلاح "ڈاکٹر" کے لئے بولی جاتی ہے) اس لئے مولوی صاحبان کو ان کی صدارت پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور تو اور یہ حضرات علوم اسلامی میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کے برعکس سینکڑوں بے علم جاہل و اعظ ہیں جو زمرۂ علماء کرام میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ جب تک ذہنوں سے یہ تصور نہیں جائیگا کہ اسلامی علوم سے واقفیت مولوی صاحبان کی اجارہ داری ہے، اس وقت تک قوم دین و دانش میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

۷۔ یہ تو رہا مذہب پرست طبقہ کا حال۔ ہمارے دانشمند طبقہ (INTELLIGENTSIA) کی کیفیت ان سے بھی عجیب ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے کمرے میں بیٹھے علماء کے طبقے کی ہزار برائیاں بیان کریں گے۔ یہ گھنٹوں اس حقیقت پر لیکچر دیں گے کہ قوم کی تباہی کا موجب یہی طبقہ ہے۔ پاکستان انہی کے ہاتھوں تعرِ مذلت میں گر رہا ہے یہ ہمیں کبھی ابھرنے نہیں دیں گے۔ لیکن حرام جو کمرے سے باہر نکل کر یہ ان میں سے ایک بات بھی زبان پر لائیں۔ اتنا ہی نہیں۔ انہیں ایک دن آپ کمرے کے اندر یہ کچھ کہتے سنیں گے تو دوسرے دن دیکھیں گے کہ یہی علماء کرام کے کسی جلسہ کی صدارت فرما رہے ہیں۔ امام مسجد کو گالیاں بھی دینگے اور نماز جنازہ کیلئے بھی اسی کو بلائیں گے مسجد میں اس کا خطبہ سنیں گے اور گھر پہنچ کر اس کو صلواتیں سنائیں گے۔ طلوع اسلام کا ذکر آئے گا تو اس کیلئے ہمہ تن توصیف ہوں گے۔ لیکن سخت احتیاط برتی جائے گی کہ باہر کسی کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ اس شدتِ احتیاط میں، عند الضرورت (یعنی مصلحت کے ماتحت) یہ طلوع اسلام کی مخالفت پر بھی اتر آئیں گے۔ قانون سازی کے سلسلہ میں یہ اس مسلک کو صحیح قرار دیں گے جس کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا ہے۔ لیکن اس کا اعلان

کبھی نہیں کریں گے۔

اس طبقہ کی یہ مداہنت ہے جس کی وجہ سے جہالت کی گرفت ملک پر دن بدن شدید ہوتی جارہی ہے اور نئی نسلوں کے دل سے ہر قسم کا احترام اٹھ چکا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بڑوں کی منافقت کا یہ عالم ہے تو ان کے دل میں ان کی کسی بات کا احترام کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

اور یہی ہے ان کی مداہنت جو ملک کو قانون سازی کے شعبہ میں بھی ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ یہ قدم اُس وقت آگے بڑھ سکے گا جب اس طبقہ میں اتنی جرأت پیدا ہو جائے گی کہ جس بات کو یہ خلوت میں حق و صداقت سمجھتے ہیں جلوت میں اس کا دھڑلے سے اعلان کریں اور کسی قسم کی کوئی مصلحت ان کے آڑے نہ آئے۔

اور اگر ایسا نہ ہوگا تو قوم کے اس چاک گریباں کی دھجیاں اور زیادہ بکھر جائیں گی۔

پی۔ آئی۔ اے کا قومی حادثہ اور حکومت کا فریضہ

پرچہ پریس کے لئے تیار تھا کہ ایک دردناک حادثہ کی خبر ملی۔ یہ خبر پی۔ آئی۔ اے کے اس بوئنگ طیارہ سے متعلق تھی جو قاہرہ کے قریب ایک ریگستان میں گر کر تباہ ہو گیا اور اس میں بہت سی جانیں ضائع ہو گئیں۔ جہاں تک ایسے حادثات کی آئندہ روک تھام اور اس سلسلہ میں احتیاطی تدابیر کا تعلق ہے، حکومت اور پی۔ آئی۔ اے ان معاملات کو ہم سے بہتر جانتی ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے۔ کی سروس دنیا کی بہترین سروسز میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور اپنے حسنِ انتظام کے لحاظ سے بھی خاصی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اسکے باوجود اگر یہ حادثہ رونما ہوا تو ہمیں یقین واثق ہے کہ یہ کسی بے احتیاطی یا بدانتظامی کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے ہوا ہوگا کہ انسان ابھی سلسلہ کائنات میں بہت سے امور پر دسترس پانے کے قابل نہیں ہوا۔

جو جانیں اس حادثہ کا شکار ہوئیں ان کی بازآفرینی تو اب ممکن نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سوال ان پسماندگان کا ہے جو مرنے والے اپنے پیچھے حرماں نصیبی اور بیچارگی کے عالم میں چھوڑ گئے۔ طلوع اسلام پاکستان میں جس قرآنی نظام کیلئے کوشاں ہے اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ معاشرہ میں کسی کی نشوونما رکنے نہ پائے۔ یہ کسی حادثہ کا شکار ہونے والوں کے پسماندگان ہوں یا دیگر افرادِ مملکت۔ ان کی نشوونما کا سامان مہیا کرنا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس قومی حادثہ کے سلسلے میں بھی ہم کارفرمایانِ مملکت کی توجہ اس اہم ضرورت کی طرف دلاتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جو لوگ اس حادثہ کی نذر ہو گئے ان کے پسماندگان کی کفالت کی طرف فوری توجہ مبذول کی جائے گی اور اس سلسلہ میں جو کچھ ممکن ہو اس کے متعلق ضروری انتظامات بلا تاخیر عمل میں لائے جائیں گے۔

حرفِ دِل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد زِ درمانے کہ من دارم

زِ کفرِ من چہ می خواہی زایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جرعۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دلے بریاں زِ عشقِ مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاراں مطلع ہا دارد گریبانے کہ من دارم

زبرہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ ہم چو برہانے کہ من دارم

سید احمد خان

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء

(جب پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی گئی)

[۲۴ مئی کی شام کو ایک عام اجتماع میں پرویز صاحب کا برجستہ خطاب]

برادرانِ عزیز! اسلام و رحمت۔

مدینہ میں قیامِ نظامِ خداوندی کے بعد مسلمانوں کو ان کی پہلی حالت کی یاد اس طرح کرائی گئی تھی کہ۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ۔ تم اپنی اس حالت کو یاد کرو جب تم تعداد میں بہت کم تھے۔ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ اور اتنے کمزور و ناتواں تھے کہ مخالفین تمہیں کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ نامساعد حالات کی وجہ سے تمہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ دشمن تمہیں اچک کر لے جائیں فَاٰوٰىكُمْ ۔ ضعف و ناتوانی۔ بے کسی و بے چارگی اور خوف و ہراس کے اس لرزہ انگیز عالم کے بعد خدا نے تمہیں ایک محفوظ مقام پر پناہ دی وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ اور اپنی تائید و نصرت سے تمہارے لئے قوت کا سامان پیدا کر دیا وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور نہایت فراوانی سے تمہیں خوش گوار رزق عطا کیا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۸/۲۶) تاکہ زندگی کے ان بلند مقاصد کے حصول کے لئے جو تمہارا منتہائے نگاہ تھا، تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت

۱۸۵۷ء کے سانحہ ہوشربا کے بعد مسلمانانِ ہند کی حالت بعینہٖ یہی (بلکہ اس سے بھی بدتر) ہو گئی تھی۔ ان کی سلطنت لٹی۔ دولت و حشمت تباہ ہوئی۔ عزت و ناموس کو غارت کیا گیا۔ ان کے ابنائے قوم کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ ان کی متاعِ زیست کی کوئی شے محفوظ نہیں تھی۔ خوف و ہراس ان پر چاروں طرف سے طاری تھا اور انہیں امید کی کوئی کرن کہیں سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک طرف انگریز جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے

ہیں یہ تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ مسلمان کو اس برصغیر میں اس طرح ختم کیا جائے کہ ان کا جداگانہ تشخص باقی نہ رہے دوسری طرف ہندوان سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لینے کے لئے دانت پیس رہا تھا۔ اس نے حسب عادت مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کے سچے جھوٹے الزامات لگا کر انگریز کو بھڑکانا شروع کر دیا اس سلسلہ میں۔ لائل محمڈنز آف انڈیا میں سرسید لکھتا ہے:۔

"اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا ہے، خواہ وہ کسی رام دین یا ماتا دین ہی نے کیوں نہ برپا کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمان کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے متعلق یہ نہ مشہور کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا۔

اس قوم پر احسان

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے اس قسم کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد کہا تھا کہ وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ۔ ہم نے چاہا کہ اس قوم کو جسے اس بری طرح سے کچلا گیا تھا اپنے احسانات سے نوازیں وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً انہیں ذلت و پستی کے گڑھوں سے نکال کر اقوام عالم کی امامت کے منصب پر سرفراز کریں۔ وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۸/۵) انہیں فرعون کی مملکت (کے ایک حصہ) کا مالک بنا کر ملک میں اقتدار و حکومت عطا کریں اس مقصد کے لئے ان میں صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰ کو پیدا کیا گیا۔

نبوت کا سلسلہ نبی اکرم کی ذات گرامی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس لئے اب اس قسم کے عظیم انقلابات کیلئے حضرات انبیاء کرام کی بعثت نہیں ہو سکتی۔ اب ان محیر العقول تغیرات نے ان انسانوں کے ہاتھوں رونما ہونا تھا جو خدا کے نازل کردہ ضابطہ قوانین (قرآن کریم) سے بصیرت حاصل کر کے قوم کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کریں۔ اس مقصد کے لئے ان یاس انگیز اور مرگ آفریں حالات میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہندی مسلمانوں کو حیات نو عطا کرنے کے لئے ایک بطل جلیل پیدا ہوا جو دنیا میں سرسید کے نام سے متعارف ہوا۔

سرسید کی نمود

سرسید کوئی "مامور من اللہ" نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا۔ عام انسانوں کی زندگی جیا۔ لیکن کام وہ کر گیا جس نے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب مولانا حالی نے سرسید کے سوانح حیات مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو سرسید سے اس کی زندگی کے متعلق پوچھا اس کے جواب میں سرسید نے جو کچھ کہا وہ اس کے بلند کردار کی زندہ شہادت ہے۔ اس نے کہا۔

میری لائف میں اس کے سوا کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں۔ کنکوے اڑائے۔ کبوتر پالے، ناچ
مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔

یاد رکھئے، یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب سر سید کی عظمت کا شہرہ ساری دنیا میں پھیل چکا تھا اور ان کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودہ، جھولیاں بھر بھر کر پھل دے رہا تھا۔ اس وقت ایسا اعتراف وہی عظیم انسان کر سکتا ہے جسے مبداء فطرت نے خلوص و دیانت کی نعمت سے نوازا اور انتہائی کشادہ نگہی اور فراخ حوصلگی کی دولت سے سرفراز کیا ہو یہ کسی مصنوعی لیڈر کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ مصنوعی لیڈر تو اپنے آپ کو پیدائشی ولی کہا کرتے ہیں۔

برادران عزیز! اس وقت میرے پیش نظر نہ سر سید کے سیاسی کارنامے ہیں نہ مذہبی اصلاحات۔ نہ انکی معاشرتی خدمات ہیں نہ ادبی تعمیرات۔ میں اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سر سید نے اس تاریکیوں میں گھری ہوئی قوم کے مستقبل کے متعلق کیا سوچا اور اسے کس طرح ایک زندہ جاوید عملی پیکر عطا کیا۔ سب سے پہلے اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے خلاف "بغاوت" کا الزام لگا کر انہیں ہر قسم کے ظلم و استبداد اور جور و تشدد کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ اس کے لئے اپنا مشہور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک ماحول میں یہ جرأت رندانہ

اسباب بغاوت ہند

کتنے مہیب خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا اس کا اندازہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سیکریٹری (مسٹر بیڈن) کے ان الفاظ سے لگائیے جو اس کے سینے کے جوشِ غیظ و غضب کے غماز ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ

> اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ فوراً باز پرس کی جائے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جائے۔

اور یہ بات شائد آپ کو معلوم نہ ہو کہ سر سید اس وقت حکومت کی ملازمت میں تھا۔ ملازم حکومت۔ اور حکومت بھی "غدر" کے زمانے کی۔ لیکن اس کی جرأت بے باک اپنا کام کر گئی۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور اخبار ہوم نیوز نے اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

> سر سید نے انتہائی دلیری سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اس کی اس جرأت مندانہ رائے نے حکمران طبقہ کو بے حد متاثر کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بہت پہلے پنجاب اور سرحد میں، سید احمد بریلوی (علیہ الرحمۃ) کے زیر قیادت جہاد کی ایک تحریک سرگرم عمل تھی۔ جو عوام میں "وہابی تحریک" کے نام سے مشہور تھی۔ "غدر" کے بعد انگریز اور ہندو کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ جو مسلمان ان کی نگاہوں میں کھٹکتا اس کے متعلق کہہ دیتے کہ وہ وہابی ہے اور اس کے بعد اسے

حوالہ دار درسن کر دیتے۔ چنانچہ کسی بڑے شہر اور قریہ میں کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر ان "وہابیوں" کی لاشیں تڑپتی اور لٹکتی دکھائی نہ دیتی ہوں۔ بے گناہ لوگوں کے اس خونِ ناحق سے سرسید کا خون کھول گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اس میں خود کود جائے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ انگلستان کے پارلیمنٹ کے ایوان تک میں اپنا یہ نعرہ پہنچا دیا کہ

اگر وہابی ہونا کوئی جرم ہے تو سن رکھو کہ سب سے بڑا وہابی میں ہوں۔

جب سرسید کے ان جرأت مندانہ اقدامات سے مسلمانوں کے اس طرح بے محابا قتل و غارت گری کا سیلاب تھم گیا تو اسے ان کے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ ان کی غصب شدہ جائدادیں اور لٹی ہوئی دولتیں انہیں واپس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں انکی عظمت رفتہ کا مالک بنانا چاہتا تھا، اسنے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قوموں کی نشاۃ ثانیہ کا راز کیا ہے! اپنے اوپر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر لی۔ تا آنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ گئی کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

حیاتِ تازہ کی تدبیر

اس نے اس حقیقت کو پا لیا کہ قوم کی حیاتِ تازہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ اس میں ایسے انسان پیدا کئے جائیں جو ان فرسودہ راستوں کو چھوڑ کر جہاں سے قوم کے جنازے قبرستانوں تک پہنچے تھے۔ اپنی جدتِ فکر اور ندرتِ عمل سے نئی راہیں تراشیں جو کاروانِ ملت کو ان کی منزلِ مقصود تک لیجائیں۔ وہ قوم میں انسان پیدا کرنا چاہتا تھا۔ دیکھئے وہ اس حقیقت کو کیسے درخشندہ الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

میں جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصے کی جو نیلا نیلا اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ بلکہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوم کی نگاہوں میں باعزت بنا سکتے ہو؟

انسان سازی کی اس اہم کو شروع کرنے سے پہلے۔ اس نے ایک طرف اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ جو قوم اپنے زمانے کی علمی سطح تک نہیں پہنچتی وہ کبھی اقوام عالم کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ دوسری

طرف اس نے دیکھا کہ (کم از کم) ہندوستان میں آنے والی حکومت جسمانی قوت سے کہیں زیادہ ذہنی صلاحیت کے بل بوتے پر قائم ہوگی۔ بغاوتِ ہند کے ایک ہی سال بعد (یعنی ۱۸۵۸ء میں) کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں جدید علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہوگئی تھیں۔ جن میں ہندو جوق در جوق داخل ہو رہے تھے لیکن مسلمانوں کے علماء کرام نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے اس لئے مسلمان اسے شجرِ ممنوعہ سمجھ رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیس سال میں صرف بیس مسلمان گریجوایٹس ہو سکے۔ ان یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے غیر مسلم حکومت کی مشینری میں داخل کار ہوتے جا رہے تھے اور مسلمانوں نے اپنے آپ پر اس کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ سرسید نے اس صورتِ حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور ۱۸۶۴ء میں جب کہ وہ غازی پور میں تعینات تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی جس کا اولین مقصد یہ تھا کہ عصرِ حاضر کے علوم سے متعلق جو کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہوں ان کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ مسلمان ان علوم سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے بعد ان کے دل میں خود ان علوم کی تحصیل کا شوق بیدار ہو۔

ہندو کی مسابقت

سائنٹفک سوسائٹی

اس کے بعد سرسید نے دوسرا قدم اٹھایا اور غازی پور میں جدید خطوط پر ایک مقامی مدرسے کی داغ بیل ڈالی۔ سرسید کے دل میں علم کی عظمت کا احساس کس قدر شدید تھا اس کا اندازہ اس دعا سے لگایا جا سکتا ہے جو اس مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت ان کے لبوں پر ان الفاظ میں آگئی تھی۔ انہوں نے انتہائی رقتِ قلب کے ساتھ کہا۔

سرسید کی دعا

اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بیشک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسی کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لئے مفید ہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں ان کے لئے بھی ایک روشنی ہے..... اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اسے قبول فرما اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے۔ اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

جب سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے تو سائنٹفک سوسائٹی بھی ان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگئی یہاں پہنچ کر انہوں نے سوسائٹی کا اخبار۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا اور اس طرح علومِ جدید کی اہمیت اور افادیت کا چرچا دور دور تک ہونے لگا۔

لیکن یہ کوشش کچھ ابتدائی اور مقامی سی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مستقبل کے متعلق سرسید جو کچھ سوچ رہا تھا اس کا عملی پروگرام ہنوز اس کے ضمیر کی گہرائیوں میں پہلو بدل رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کی تعلیم کو ایک دعا لمگیر نہیں تو کم از کم ملک گیر حیثیت دینا چاہتا تھا۔ لیکن سرسید تو ایک عملی انسان تھا۔ وہ اپنے ہر نظریے کیلئے ذاتی معلومات اور تجربہ حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ عصر حاضر کی تعلیم کا مرکز اور سرچشمہ اس زمانے میں یورپ ہی تھا اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یورپ جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس تعلیم کا نہج اور طریق کیا ہے؟ اس زمانے میں یورپ کا سفر کوئی آسان بات نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ اخراجات کا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا۔ کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ ان

یورپ کا سفر صعوبات سفر اور مالی مشکلات کا ذکر کرتے تو وہ کہتے کہ یہ سب بجا اور درست ہے لیکن میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذات خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت نہ حاصل کر لوں؟ چنانچہ وہ اپنے دونوں بیٹوں سمیت اپریل ۱۸۶۹ء میں یورپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں انہوں نے جو کچھ دیکھا کس نگاہ سے دیکھا اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں۔

> میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی۔ جب کبھی عالموں اور مہذب لوگوں کو دیکھا۔ جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں۔ جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے۔ جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے۔ یہاں تک کہ جب کوئی خوبصورت شخص دیکھا تو مجھ کو ہمیشہ اپنا وطن اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں، جہاں تک ہو سکا ہر موقعہ پر میں نے مسلمانوں کی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔
>
> سب سے اول یہی تدبیر سوچی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھوں سے ایک مدرسۃ العلوم (کالج) قائم کیا جائے۔

واپسی سرسید سفر یورپ کے اس ماحصل کو اپنے قلب و نگاہ کے دامن میں سمیٹ کر، اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس ہندوستان پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے ایک کمیٹی بنائی۔ جس کا نام تھا "خواستگار ترقی تعلیم مسلمان" جس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ تحقیق کرے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے کیوں ہیں۔

تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق انسان کے ذہن سے ہے اور اس کی مشکلات انتظامی سی۔ لیکن سرسید کے نزدیک اس مسئلہ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی اس کیلئے یہ مسئلہ اس کی زندگی کا جزو اور ایمان کا تقاضہ بن چکا تھا۔ جس کا تعلق ذہن کے علاوہ انسان کے نازک ترین جذبات سے بھی ہوتا ہے۔ اس باب میں سرسید کے جذبات کی شدت کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ آپ اس

واقعہ سے لگائیے جسے سرسید کے قریب ترین رفیق، نواب محسن الملک نے بیان کیا ہے۔

نالۂ نیم شبی

خواستگار ترقی تعلیم کی کمیٹی کے پہلے اجلاس میں شرکت کی غرض سے نواب محسن الملک جلسہ کے انعقاد کی تاریخ سے ایک دن پہلے پہنچ گئے اور سرسید کے ہاں ہی قیام کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے سرسید کو اپنے پلنگ پر نہ پایا۔ میں انہیں دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے۔ اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جا رہے ہیں۔ اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ میری ساری رات اس اُدھیڑ بُن میں گزر گئی ہے کہ دیکھئے کل جلسہ کا انجام کیا ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔

نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گذری اسکو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔

فکر و نظر کا وہ عالم کہ اصول و طریق تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے قرض اٹھا کر یورپ کا سفر اختیار کرتے ہیں اور سوز و گداز کی یہ کیفیت کہ اس غم میں راتیں رو رو کر گزار دیتے ہیں کہ مسلمان بگڑتے جا رہے ہیں اور ان کے سنبھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس کمیٹی نے ابتدائی تحقیق کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ بڑے بڑے اہل الرائے حضرات سے مشورے کئے سارے ملک سے تجاویز منگائیں۔ اشتہارات شائع کئے۔ مضامین لکھوائے۔ جلسے کئے۔ چندہ جمع کیا۔ رپورٹیں مرتب کیں اور اس ملک گیر مہم کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ علی گڈھ کو جدید تعلیم کا مرکز قرار دیکر کام کی ابتدا کر دی جائے خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر کیوں نہ ہو۔ چنانچہ طے پایا کہ سب سے پہلے ایک ماتحت مدرسہ کا اجراء کر کے اہل ملک کو نمونتہً دکھایا جائے کہ ہمارے پیش نظر مقصد کیا ہے۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ ایک مدرسہ کی بنیاد نہیں تھی بلکہ جیسا کہ میں آگے چل کر عرض کروں گا یہ درحقیقت پاکستان کی پہلی اینٹ تھی۔ اس کے بعد سرسید نے محسوس کیا کہ اب ملازمت میں رہتے ہوئے کام کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ اب مجھے سارا

ابتدائی مدرسہ کی تاسیس

وقت اِس تحریک کے لئے وقف کر دینا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر علی گڑھ کو مستقل طور پر اپنا مسکن بنا لیا۔

اس مقام پر اتنا اور عرض کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ سرسید کی بیوی کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہو گیا تھا جب سرسید کی عمر چوالیسؔ سال کی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد شادی نہیں کی تاکہ گھر کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر اپنی پوری زندگی اِس مقصد کے لئے فارغ رکھی جائے۔ مقصد سے عشق اسے کہتے ہیں۔

چندہ کی مہم

سب سے پہلا مرحلہ، اس درس گاہ کے لئے عمارات کا تعمیر کرنا تھا اور چونکہ اسکیم یہ تھی کہ اسے کالج اور پھر یونیورسٹی تک لیجایا جائے گا۔ اس لئے عمارات کی اسکیم وسیع پیمانے پر تیار ہوئی تھی۔ اس کے لئے کافی روپے کی ضرورت تھی۔ جو پبلک کے چندے ہی سے مہیا ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے سرسید جھولی بغل میں ڈال کر چل نکلا اور ملک کے کونے کونے میں پہنچا لوگوں سے ایک ایک پیسہ بھیک کے طور پر مانگا۔ اِس کے لئے وہ کوئی گوشہ چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ پٹیالہ گئے تو معلوم ہوا کہ وزیر ریاست کے ہاں پوتہ پیدا ہوا ہے اس کی خوشی میں عام رسم کے مطابق چراغی کے پانچ روپے مانگنے کے لئے چلے گئے ___ جس پر انہوں نے ایک معقول رقم نذر کر دی۔ ان کے ایک دوست دور دراز سفر کر کے علی گڑھ آئے۔ آپ سے ملنے گئے تو کہا کہ میں سید ہوں، امام ضامن کا روپیہ مانگنے آیا ہوں۔ ان سے اشرفی لے کر ٹلے۔ دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ جہاں جاتے وہ دعوت کرتے۔ دعوت قبول کر لیتے۔ لیکن بعد میں کہہ دیتے کہ بابا! جو کچھ میری ضیافت میں خرچ کرنا ہے مجھے نقد دے دو۔ ان سے نقد لے لیتے اور روٹی اپنی گرہ سے کھا لیتے۔ اس زمانے کے لکھے ہوئے ایک آرٹیکل میں کہتے ہیں۔

> ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی اب ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے

ایک دن اپنے ایک قدیمی دوست سے چندہ کا تقاضا کیا تو انہوں نے بدمزہ ہو کر کہا کہ صاحب! ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے۔ سرسید نے کہا کہ اے میاں! جب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے۔ پھر کون تم سے چندہ مانگے گا۔ یہ الفاظ کچھ اس طور پر ادا کئے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً دے دیا گیا۔

انہوں نے اپنی دوستی اور رشتہ داری کے تعلقات تک کو کالج کے لئے چندہ کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی استطاعت تھے لیکن کالج کے کچھ سرگرم معاون نہیں تھے۔ صاف کہلا بھیجا کہ مدرسہ کی مالی مدد کے بغیر ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

اور طریقوں سے روپیہ کی فراہمی

چندہ مانگنے کے علاوہ انہوں نے بے شمار اور طریقوں سے بھی روپیہ اکٹھا کیا کبھی اپنے دوستوں کی کتابیں بیچ کر روپیہ پیدا کیا۔ کبھی علی گڑھ کی نمائش

میں کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لئے دکان پر بیٹھے۔ کبھی اپنی تصویر کی کاپیاں فروخت کر کے پیسے جمع کئے اور ایک بار اس سلسلے میں وہ کچھ کیا جس کا ذکر تو ایک طرف تصور تک سے ہر حساس انسان لرز اٹھتا ہے۔

بات یوں ہوئی کہ غریب طالبعلموں کو وظائف دینے کے لئے روپے کی ضرورت پیش آئی جو کسی طریق سے فراہم نہ ہو سکا۔ سرسید نے مجبور ہو کر ایک تماشے کا اہتمام کیا۔ اس پر دوستوں نے منع کیا کہ ایسا نہ کیجئے لوگ مطعون کریں گے۔ اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا کہ اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ ہو سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ بھی خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے در حقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔ چنانچہ تماشہ دیکھنے کے لئے لوگ جمع ہو گئے تو سرسید خود اسٹیج پر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ایک مؤثر تقریر کی اور کہا۔

> کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی شیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لئے کئے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے مکر و ریا کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقعے کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر بدصورتی اور دل کی برائی کا کوئی علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو نکبت و ذلت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کریں جن سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جائے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔

کہتے ہیں سامعین میں سے کسی منچلے نے کہا کہ آپ اسٹیج پر خود غزل گا کر سنائیں تو ہم چندہ دیں گے۔ اس پر سرسید نے گا کر غزل سنائی اور چندہ وصول کر لیا۔

غور فرمائیے! ایک ستر اسی سال کا بوڑھا۔ عالمگیر شہرت کا مالک بھاری بھرکم انسان اور اسٹیج پر غزل گا رہا ہے۔ کاہے کے لئے؟ تاکہ مدرسے کے غریب طالب علموں کے وظیفے کا انتظام ہو جائے ـــــ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

چندہ جمع ہوا۔ مدرسہ (یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو) کالج میں تبدیل ہو گیا۔ کالج کی عمارات تعمیر ہو گئیں۔ ایسی عمارات کہ انہیں دیکھ کر ایک ایرانی سیاح بے اختیار پکار اٹھا۔

واللہ معجزہ می نماید۔ کارے کہ از سلطنت برنیاید چگونہ از یک فرد رعیت سرانجام شد

کفر کے فتوے

سرسید اس لٹی پٹی قوم کی بازآفرینی کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا۔ اور ہمارے علمائے کرام اس کے پیچھے کفر کا ڈنڈا لئے لئے پھر رہے تھے۔ جب سرسید نے مدرسہ کی بنیاد رکھی تو ایک مولوی صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا کہ۔

جو لوگ مدرستہ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں۔

جب سرسید کی کوششیں کچھ اور آگے بڑھیں تو دہلی سے ایک مفتی صاحب (مولوی کریم اللہ) اٹھے اور انہوں نے فتویٰ دیدیا کہ

ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم وتحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرہ حیوانیت میں داخل ہونا ہے۔ بالکل عاطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں مساعی ہونا ہیمہ اور حطب بنتا لازم۔ الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور ہاں کی اور نشہ سمجھنا اپنے مال کا خیال خام ہے۔ نے نے یوں سمجھو کہ اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہے۔

فرنگی محل (لکھنؤ) کے مولوی عبدالحئی صاحب آگے بڑھے اور فرمایا کہ

یہ شخص مخرب دین اور ابلیس لعین کے وسوسے سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے۔

حرمین سے فتوے منگائے گئے

جب یہاں کے فتوے سے جی نہ بھرا تو دوڑے دوڑے مکہ معظم پہنچے اور وہاں سے مفتیانِ مذاہب اربعہ کا فتویٰ حاصل کیا جس میں لکھا تھا۔

یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے۔ اس کا فتنہ یہود ونصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا اس کو سمجھے۔

اس سے بھی آگے بڑھے تو مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شریعت سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کر لیا تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہو دین کی حفاظت کے لئے اگر اس کا مدرسہ بن جائے تو اس کا منہدم کر دینا واجب ہے۔

سرسید ملک کے گوشے گوشے میں جھولی بغل میں ڈالے اُمتِ مرحومہ کے تحفظ کے لئے بھیک مانگتا پھرتا

اور ہمارے یہ حامیانِ دینِ متین اور علمبرداران شرع مبین اس کے پیچھے فتاویٰ کا پلندہ لئے پھرتے تھے جہاں اس کا لیکچر ہوتا شور مچایا جاتا لوگوں کو مشتعل کرکے فساد کرا دیا جاتا۔ چندہ دینے والوں کو گھیر گھیر کر روک دیا جاتا۔ عوام کو اس کے قتل کیلئے اکسایا اور بھڑکایا جاتا۔ اسے آئے دن قتل کی دھمکیوں کے خطوط اور پیغام ملتے رہتے۔ سفر اور حضر میں اس کے لئے خطرے کے سامان پیدا کئے جاتے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کون تھا جسے دینِ محمدی کا مخرب اور ابلیسِ لعین کہا جاتا تھا۔ سنئے برادرانِ عزیز! یہ کون تھا۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب

سر ولیم میور یوپی کا گورنر تھا، آج کا نہیں اس زمانے کا گورنر اور اس صوبے کا گورنر جس میں سرسید سرکاری ملازمت میں تھا۔ اسنے حضور سرورِ کائنات کی سیرت پر ایک کتاب لکھی جس میں نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم پر بڑے نارو احملے کئے۔ یہ تمام محافظین دینِ متین اپنے اپنے حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھے دین کی حفاظت کر رہے تھے۔ اور ساری ملک میں ایک "کافرو ملحد" تن تنہا تھا جس نے سر ولیم میور کو چیلنج دیا اور کہا کہ دیکھو! میں تمہارے اعتراضات کی قلعی کس طرح کھولتا ہوں۔ جب سرسید نے جواب لکھنے کی ٹھانی تو دیکھا کہ اس کے لئے کافی مواد موجود نہیں۔ متعلقہ کتابیں انگلستان میں مل سکتی ہیں۔ وہ جب تعلیمی مشاہدہ کے لئے انگلستان گیا ہے تو اس پروگرام کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور لندن کے کتب خانوں میں بیٹھ کر سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ کتاب مرتب ہوگئی۔ تو اس کے چھپوانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اس پر قریب چار ہزار روپے لاگت آتی تھی۔ اس نے اپنی کتابیں، گھر کا سامان۔ کھانے پکانے کے برتن بیچ کر، سود پر قرض لے کر۔ اپنے کھرے دوستوں سے بھیک مانگ کر بڑی مصیبت کے ساتھ یہ روپیہ فراہم کیا اور اس کتاب کو چھپوایا۔ اس زمانے میں نواب محسن الملک کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> چاہے میں محتاج۔ فقیر، بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں۔ مگر کتاب ضرور چھپواؤں گا تاکہ جب قیامت کے دن میرا نام پکارا جائے تو خدا فرمائے کہ "سید احمد" کو بلاؤ جو اپنے نانا کے نام پر فقیر ہو گیا۔"

سارا روپیہ ختم ہو گیا اور سرسید کے پاس ولایت سے واپس آنے کا کرایہ تک نہ رہا۔ معلوم اس نے کس طرح اس کا انتظام کیا۔ یہ تھا وہ "کافر و ملحد" جس کے خلاف مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تک سے فتوے منگائے جا رہے تھے۔ یہ تو خیر پھر بھی ناموسِ رسالت پر مر مٹنے کا سوال تھا۔ سرسید کی حمیتِ دینی کی شہادت تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک دیتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک مخلص دوست (غالباً نواب وقار الملک) کا واسطہ

ایک ایسے عیسائی افسر سے پڑا جو دفتر کے اوقات میں نماز پڑھنے پر معترض تھا۔ انہوں نے ایک خط میں اس بات کی اطلاع سرسید کو دی اور اُن سے مشورہ طلب کیا۔ سرسید نے خط ملتے ہی انتہائی غم و غصہ کے عالم میں انہیں لکھا

سرسید کی دینی حمیت

آج خط ملا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھ لیتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا کبھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں.... یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ لیکن تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا نہایت بجر پن کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ لیکن کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا اور سستی میں ڈالنا میرے نزدیک کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ نواق سے استعفیٰ دے دیا تھا اور کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان وقادر مطلق کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی؟ کیا ہوتا نوکری میسر نہ آتی۔ فاقے سے مرجاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام۔

یہ تھا وہ مرد غیور جس کے خلاف کفر اور الحاد کے فتوے شائع کئے جاتے تھے۔ اس نے تمام فتووں کا جواب ایک شعر میں دے دیا۔۔۔۔ سنئے کہ وہ کس سوز و گداز اور تپش و خلش سے کہتے ہیں کہ

خدا دارم۔ دلے بریاں زعشق مصطفےٰ دارم ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

سرسید نے کفر کے ان فتووں کے جواب میں کسی کو گالی نہیں دی کسی پر غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن جو کچھ کہا وہ اصولی طور پر ایسا ہو کہ اس قسم کے فتووں کے جواب میں جو ان حضرات کی طرف سے ہر زمانے میں ہر اس شخص کے خلاف صادر ہوتے رہتے ہیں جو کسی بات میں بھی اُن سے اختلاف رکھتا ہو۔ پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے لکھا۔

فتووں کا جواب

ہم کو ملحد، زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری قوم نے خدائے ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی خیالات کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہؐ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنا لیا ہے۔ اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جد امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بت توڑنے

والے تھے۔ ہم سچے خدائے ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں۔ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق تھا وہ کفر و الحاد کے ان فتووں سے اثر نہیں لیتے تھے، لیکن جب یہ حضرات کالج کے لئے چندہ کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے تھے تو اس سے سرسید کو بہت دکھ ہوتا تھا ــــ کس قدر دکھ ہوتا تھا اس کا اندازہ ان کی اس تقریر کے چند فقروں سے لگائیے جو انہوں نے لاہور میں اس وقت کی جب وہ کالج فنڈ کے لئے پنجاب کا دورہ کر رہے تھے اور مولوی صاحبان ان کے پیچھے ڈگڈگی لئے پھر رہے تھے انہوں نے اس عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

لاہور میں خطاب

اے بزرگانِ پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کے لئے کوشش کرے تو کیا آپ اسے اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ جو ہڑے، چمار، تلی، کافر، بت پرست اور بدعقیدہ سب ہی مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک تلی، چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بنتے دیکھئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک تلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت، نامہ سیاہ کی شامتِ اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلاً ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو تو اس سے عبرت پکڑو لیکن برائے خدا اپنی قوم کی۔ اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی تو فکر کرو۔

مولانا حالی کا بیان ہے کہ سرسید کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور سامعین پر سکتہ کا عالم طاری تھا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ خلوت ہی میں نہیں وہ خلوت میں بھی اپنے ان مخالفین کے خلاف دشنام طرازی پر نہیں اترتے تھے۔ اور اپنی

کیفیتِ قلب کا اظہار کرتے تھے تو نہایت دل دوزی اور جگر سوزی کے ساتھ مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں۔

> افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا۔ جنابِ رسول اللہ موجود نہیں۔ ورنہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لے جاتا اور کہتا کہ اے خدا! اے جنابِ رسولِ خدا! محاکمہ کرو تم مجھ میں اور ان میں اور بتاؤ کہ تمہارا دوست دار آخر کون ہے۔ میں گنہگار یا یہ دیندار؟ اور انشاء اللہ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہو کر رہے گا۔

لیکن برادرانِ عزیز! اس معرکہ کے لئے تو قیامت تک کے انتظار کی ضرورت ہی نہیں اس کا فیصلہ یہیں ہو گیا ہے آج سرسید کا نام اسلام کے بہترین خادم اور ملتِ اسلامیہ کے سچے محسن کی حیثیت سے زمانہ کے صفحات پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہا ہے اور جنہوں نے اس کے خلاف فتوے صادر کئے تھے ان کا کوئی نام تک نہیں جانتا اور کہیں ان کا ذکر آتا ہے تو اس حیثیت سے کہ انہوں نے سرسید کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے تھے یعنی وہ سرسید کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ۔ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۳۷/۱۰۸-۱۱۰)

کالج کے نتائج

ملاّ کی ان تمام مخالفتوں کے باوجود کالج بن گیا اور اس کے نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی ۱۸۵۷ء میں کالج کھل گئے تھے۔ جہاں ہندوؤں نے بکثرت داخلے لینا شروع کر دیئے تھے اور مسلمانوں سے کہا جا رہا تھا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۷۵ء تک جب مدرسہ علی گڑھ کی بنیاد رکھی گئی ملک میں قریب ساڑھے آٹھ سو ہندو گریجوایٹس تھے اور صرف بیس مسلمان۔ علی گڑھ کالج ۱۸۷۷ء میں کھلا اور اس کے بیس سال بعد (جب سرسید کی وفات ہوئی) ملک میں ۳۴۶ مسلمان گریجوایٹس اور ۱۰۷۰ ہندو گریجوایٹس تھے۔ اس کالج نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اس دیوار کو گرا دیا جو مسلمانوں کے اور علوم عہد حاضرہ کے درمیان کفر کا ہوا بنکر حائل تھی۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں دیگر مقامات (مثلاً لاہور، امرتسر، کراچی، حیدرآباد، بہاولپور وغیرہ) میں مسلمانوں کے اسکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاں ۱۸۸۲ء تک ملک میں صرف ۴۳ مسلمان گریجوایٹس تھے ۱۸۹۳ء تک ان کی تعداد ۳۰۹ تک پہنچ گئی تھی ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک صرف الہ آباد اور پنجاب میں ان کی تعداد ۱۸۵ تھی۔ عام تعلیم کی یہ حالت تھی کہ بنگال میں ۱۸۸۱ء میں کالجوں اور اسکولوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان تھے اور ۱۸۹۶ء میں ان کی تعداد چار لاکھ نوے ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ نتیجہ تھا ایک مردِ خدا اندیش و دیدہ ور کی دور نگہی اور جرأت آموزی کا۔

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

میں برادرانِ عزیز! یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور چشمِ تصور سے ان خیالات کو بھی سامنے لا رہا ہوں جو آپ کے دل میں گزر رہے ہیں کہ اگر سرسید کی ان کوششوں سے دو چار سو مسلمان لڑکے گریجوایٹس بن گئے تھے تو یہ کون ایسا معرکہ آرا کارنامہ ہے جس سے اسے قوم کا محسنِ اعظم سمجھ لیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کے حالات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے یہ بات ایسی معرکہ آرا نظر نہیں آتی لیکن سرسید کی ان کوششوں کی صحیح اہمیت و عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے دو باتوں کو پیشِ نظر رکھئے۔ سب سے پہلے یہ کہ بات دو چار سو یا دو چار ہزار مسلمان گریجوایٹس پیدا کرنے کی نہیں تھی۔ اصل بات اُس آہنی دیوار کے توڑنے کی تھی جسے قدامت پرست طبقہ کے غلط تصورات نے مسلمانوں کے اور علومِ عصرِ حاضر کے درمیان کھڑا کر رکھا تھا۔ سرسید کی بصیرتِ قرآنی نے یہ حقیقت اس کے سامنے بے نقاب کر دی تھی کہ جب تک انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر نہ کرے وہ مومن تو ایک طرف صفِ آدمیت میں کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو سکتا۔ اور فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے قوانینِ فطرت (لاز آف نیچر) کا مطالعہ لاینفک ہے۔ سرسید نے اس قرآنی اصول پر اس شد و مد سے زور دیا اور اصرار و تکرار سے نیچر۔ نیچر کا اعادہ کیا کہ وہ نیچری مشہور ہو گیا۔ اور نیچر کی اہمیت سے بے خبر مُلّا نے اسے اس پر ملحد اور بے دین قرار دے دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں سرسید کے ذہن نے بعض مقامات پر غلطیاں بھی کیں لیکن غلطیاں ہر بانیٔ (رسابقِ اول) سے ہوتی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر سرسید، علمِ فطرت کے اس دروازے کو مسلمانوں کے سامنے نہ کھولتا تو آج ہم کس مقام پر کھڑے ہوتے اور اقوامِ عالم میں ہمارا کیا حشر ہوتا! دوسری بات یہ سامنے رکھئے کہ سرسید کی نگاہِ دوررس نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان کی سیاست کا مستقبل کیا ہونے والا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ انگریز مجبور ہوگا کہ حکومت کی مشینری میں اہلِ ہند کو کسی نہ کسی شکل میں شریک کرے۔ اور اس شرکت کے لئے علومِ مغرب سے واقفیت لازمی تھی۔ چنانچہ ابھی سرسید کو آنکھ بند کئے تھوڑا سا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اس کے اس اندازے نے عملی شکل اختیار کر لی شروع کر دی۔ حکومت نے کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا فیصلہ کیا۔ اور اب یہ مسئلہ زیرِ غور آیا کہ اس میں شرائطِ انتخاب کیا ہوں۔ ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ یہ انتخاب مخلوط ہونا چاہئے.......... سرسید نے ۱۸۶۵ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی... مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں۔ سرسید کے جانشین نواب محسن الملک نے انتخاب کے اس سوال کو اٹھایا اور قوم کے قریب ستر نمائندگان پر مشتمل ایک وفد لے کر گورنر جنرل کے پاس پہنچا۔ ہندوستان کی سیاست میں یہ پہلا موقعہ تھا جب مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے اس قسم کا قدم اٹھایا تھا۔ یہ کیا تھا؟ محض سرسید کی ان کوششوں کا نتیجہ کہ مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہئے۔ اس جدوجہد نے آگے چل کر مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی شکل اختیار کی اور ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا

اس کا دُوررس نتیجہ

مسلم لیگ کا وجود عمل میں آیا جس کے جائنٹ سیکریٹری علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں نواب محسن الملک اور وقار الملک تھے۔ لیگ کا صدر مقام بھی علی گڑھ ہی تھا۔ یہی وہ تنظیم تھی جو آگے بڑھتے بڑھتے تحریک پاکستان کی صورت اختیار کر گئی اور ۱۹۴۷ء میں یعنی سرسید کی وفات کے قریب پچاس سال بعد ــــ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے حسین پیکر میں نمودار ہوئی۔ ذرا سوچیئے کہ اگر اس وقت سرسید ہمت سے کام نہ لیتا اور مسلمانوں پر انگریزی پڑھنا اور مغربی علوم حاصل کرنا بدستور حرام رہتا تو

حصولِ پاکستان

اس برصغیر میں مسلمانوں کی وکالت کرنے والا بھی کوئی مل سکتا؟ اس تحریک آزادی میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو یا تو علی گڑھ کے پروردہ تھے یا سرسید کی تعلیمی تحریک کے ماتحت قائم شدہ دیگر اداروں کے پیدا کردہ ــــ اگر سرسید یہ کچھ نہ کر جاتا تو نہ محمد علی ہوتا نہ شوکت علی، نہ اقبال ہوتا نہ جناح اور ہم آج ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سرسید ہی درحقیقت پاکستان کا معمارِ اوّل ہے جس نے اس مملکت کی پہلی اینٹ اس دن رکھی تھی جب اس نے علی گڑھ مدرسہ کا افتتاح کیا تھا۔ یعنی ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی مبارک و مسعود تاریخ کو۔ آج سے نوے سال پہلے۔ اس مدرسے نے صرف گریجوایٹس پیدا کئے تھے مسلمان گریجوایٹس پیدا کئے تھے۔

مدرسۃ العلوم کی تعلیم سے سرسید کے پیشِ نظر کیا تھا اس کا اندازہ ان کے چند فقروں سے لگائیے جن سے انہوں نے ایک دفعہ اپنے طلباء سے خطاب کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

مسلمان طلباء

یاد رکھو۔ سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا۔ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے اور تبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔

سرسید کے زیرِ تربیت جو نوجوان اس کالج سے نکلے ان کے دل میں قوم کی محبت اور اسلام کا درد کس حد تک تھا اس کے لئے ان کی زندگی کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے لیکن ان میں ارکانِ اسلام کی ادائیگی کے سلسلہ میں ڈسپلن کا کیا عالم تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے جسے صدقِ جدید (لکھنؤ) کے مدیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اذان کی آواز پر

غالباً ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے۔ سرسید کی وفات یا تو ہو چکی تھی۔ یا عنقریب ہونے کو تھی۔ علی گڑھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی کہ ایک کرکٹ میچ سول سروس والوں کے مقابلہ نینی تال میں قرار پایا۔ میچ شروع ہوا اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا اور سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی اور علی گڑھ کھلا رہی تھی۔ علی گڑھ کے شہرہ آفاق باؤلر شفاق باؤلنگ

کر رہے تھے۔ بس ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو [illegible] نماز جمعہ کی اذان کی آواز کان میں آئی اور مقابلاً توقف اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ بولنگ ہی پوری کر لیتا۔ سول سروس والے اس پابندیٔ احکام پر عش عش کر اٹھے۔

یہ تھے "بے دین اور نیچری" سرسید کی درس گاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان!

کالج بڑھتا گیا۔ سرسید کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودے نے جھولیاں بھر بھر کر پھل دینے شروع کر دیے۔ کہ عین اس وقت وہ سانحہ پیش آیا جو دنیا کے ہر عظیم انسان کے ساتھ اس وقت پیش آتا ہے جب اس کی شہرت نصف النہار تک پہنچ جاتی ہے۔ چرچل نے ایک جگہ یہ بتانے کے بعد کہ جو لوگ عظمت کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں ان میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں، لکھا ہے کہ۔

"یہ عظمت بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے اور ان کے ساتھ بھی یہ بپتی ہے کہ انہیں کبھی کمتر درجے کے انسانوں کا جذبۂ حسد اور بے اعتمادی ستاتا ہے، اور کبھی انہیں دوسروں کی حماقتوں اور غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔"

اپنوں کی طرف سے مخالفت

بعینہٖ یہی کچھ سرسید کے ساتھ ہوا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ کالج کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بجائے قوم کے معتمد علیہ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کی تجویز کی اور ایک کوڈ (ضابطہ) مرتب کیا اور تمام ممبروں کے پاس رائے کے لئے بھیجا۔ خان بہادر مولوی سمیع اللہ سرسید کے قدیمی دوست اور ایک معنی میں دستِ راست تھے۔ انہوں نے اس کوڈ کی بعض دفعات سے اختلاف کیا۔ بات معمولی تھی۔ کوڈ کمیٹی کے اجلاس میں اکثریت کی آراء سے پاس ہو گیا۔ اب اس اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن خان بہادر نے اسے ذاتی سوال بنا لیا اور سرسید کی مخالفت شروع کر دی۔ اس مہم میں کچھ اور لوگ بھی اس کے شریک ہو گئے۔

اگرچہ سرسید چالیس سال سے مسلسل مخالفتیں جھیلتے چلے آ رہے تھے اور ان سے ان کے عزم و حوصلہ اور ثبات و استقامت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ ان کا جذبۂ عمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا تھا۔ لیکن وہ مخالفت بیگانوں کی طرف سے تھی۔ اب جو خود اپنوں کی طرف سے یہ طرزِ عمل سامنے آیا اور وہ بھی اس انداز کا کہ وہ محض حسد کی وجہ سے ذاتیات تک کھینچ کر لے گئے تو بالآخر۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

سرسید کے دل پر اس سے سخت چوٹ لگی اور اس نے ان کی صحت پر بڑا اثر ڈالا۔ بایں ہمہ وہ مردِ جری اسی

بلند حوصلگی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن صحت کی کمزوری۔ عمر کی زیادتی۔ کام کی کثرت ان سب نے مل کر اس شاہ بلوط کو گرا لیا اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کی شب یہ بطلِ جلیل ایک خرمنِ یاد اپنے آغوش میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا صندوق کھولا گیا تو اس میں سے صرف پانچ روپے نکلے۔ چنانچہ اس کے کفن کا انتظام بھی اس کے رفیقوں نے کیا۔ سرسید کی وفات پر ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے مختلف حصوں میں تعزیت کے جلسے منعقد ہوئے اور بڑے بڑے مشہور لوگوں نے سوگواری کے پیغامات بھیجے۔ میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مرثیہ آپکے سامنے پیش کروں گا جسے لندن کی ایک مشہور خاتون نے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کی سایہ دار شاخیں چاروں طرف دور دور تک جھومتی تھیں اور صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی۔ انہوں نے کثرت سے بیج بکھیرے اور ان کے سائے میں بنجر زمین میں حیاتِ تازہ کی نمود ہو گئی۔

بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے، اور خوبصورت پھولوں نے، جو حسن اور توانائی سے آراستہ تھے، اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ اب اشک بہاؤ اس شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اسے گرا دیا۔

غم کرو — لیکن امید کے ساتھ — کیونکہ وہ سرسبز و شاداب کھیتیاں جو اس کی عرق ریزیوں کا ثمر ہیں، اس کے مزار کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں نے اس کے آغوش میں تشو و نما پائی وہ اب پھول پھل رہے ہیں — یہ نونہال بھی اس کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی نہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔

الہ آباد کے ایک ہندو پنڈت نے کہا کہ

ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خان نہیں۔ بلکہ ہم اگر بیس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سرسید احمد خان کے برابر نہیں ہو سکتے۔

یہ تھا سرسید جو ساری عمر قوم کے غم میں گھلتا رہا، مسلسل محنت کرتا رہا لیکن کبھی شہرت کا خواہاں نہ ہوا — جو لوگ کالج فنڈ میں عطیات دیتے تھے وہ ان کے نام کتبوں پر کندہ کرا کر مناسب مقامات پر نصب کرا دیتا تھا۔ جو لوگ اپنے خرچ سے کمرے اور ہال بنوا دیتے تھے، وہ ان عمارات کو ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیتا تھا۔ لیکن اس نے نہ تو اپنے نام کا کہیں کوئی کتبہ نصب کرایا نہ کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب کیا۔ یہ بھی تجویز کی گئی کہ کالج کا نام اس کے نام پر رکھا جائے۔ اس نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ اس کی عمر کے آخری حصہ میں بعض دوستوں نے چاہا کہ (FOUNDER'S DAY) منائیں۔ سرسید

کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ جس کالج کو قوم کے ایک ایک پیسے سے تعمیر کیا گیا ہو اس کا بانی (فونڈر) کہلانے کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے منانا ہے تو (FOUNDATION DAY) نہیں بلکہ (FOUNDER'S DAY) مناؤ۔ چنانچہ اس

یوم تاسیس مناؤ

تجویز کے مطابق مدرسے کے یوم تاسیس یعنی ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی تقریب منائی جاتی رہی اور یہی وہ تقریب ہے عزیزانِ من! جسے منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ دن مدرسے علی گڑھ ہی کا یوم تاسیس نہیں بلکہ درحقیقت پاکستان کا یوم تاسیس ہے۔

جب سرسید کی مخالفت انتہائی شدت پر تھی اور اس کے رفیق اس کی مدافعت کی کوشش کرتے تھے، تو اس نے ان میں سے ایک کو لکھا۔

مجھے کہاں تک بچاؤ گے۔ میں تو ہدفِ تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔
شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

دنیا میں بڑے لوگوں کے ساتھ بالعموم یہی ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں اس لئے ان کا زمانہ ان کی صحیح قدر و قیمت نہیں پہچان سکتا۔ بعد میں آنے والے لوگ ان کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں یہی سرسید کے ساتھ ہوا لیکن سرسید کی سب سے بڑی یادگار مملکتِ پاکستان ہے۔ جب تک یہ مملکت زندہ و پائندہ ہے — خدا اسے ابدالآباد تک زندہ و پائندہ رکھے — اس وقت تک سرسید کا نام زندہ و پائندہ رہے گا اور اس کی دلسوزی کی قدر ہوتی رہے گی۔ وکذالک نجزی المحسنین۔ خدا کا ارشاد ہے۔ یہی تو وہ شمعیں ہیں جن سے انسانیت کی راہیں ہمیشہ جگمگاتی رہتی ہیں۔

کراچی میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن

ہر اتوار کی صبح ٹھیک ساڑھے نو بجے حسبِ معمول سندھ اسمبلی ہال میں بذریعہ ٹیپ شروع ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریکِ درس ہو کر اس حقیقت کو سمجھئے کہ قرآن انسانی زندگی کے اُلجھے ہوئے مسائل کا کس قدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی۔

مدرسۂ علیگڈھ سے دانشگاہ قرآنی تک

انہیں نوید سحر دو کہ ایک مدت سے
تڑپ رہے ہیں اندھیروں میں روشنی کے لئے

(۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کی یاد میں)

★ — صفدر سلیمی

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ نگاہوں کے سامنے لائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک قوم مدت سے غلامی، بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں چلی آ رہی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی غلامی اور محکومی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس کی ذلّ و شکست اور مایوسیوں کے اندھیرے عروج و اقبال کی صبح بہاریں بدل جاتے ہیں۔ اور وہ قوم زندگی کی ایک نئی انگڑائی لے کر کارگہ سعی و عمل میں کود پڑتی ہے۔ سطح بین نگاہیں نہ تو اس انقلاب کے پس منظر کی گہرائیوں میں جا سکتی ہیں اور نہ تاریخ کے بین السطور سے اس سلسلہ انقلاب کی ان ابتدائی کڑیوں کا تجزیہ کر سکتی ہیں جہاں یہ انقلاب ابھی اس قوم کے ضمیر میں کروٹیں لے رہا تھا اور افرادِ قوم کے قلب و نگاہ میں اس کے بیج بوئے جا رہے تھے۔ اس سطح بینی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس انقلاب کی تاریخ کا آغاز اس مرحلہ سے گردانا جاتا ہے جب کہ وہ محسوس و مشہود طور پر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اور اسی کی بناء و تاسیس کے سہرے بھی اُن صرف پر بندھ جاتے ہیں جن کی بدولت یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان قرار پا گیا۔

طائرانِ پیش رس

لیکن تاریخ کا کوئی مورخ اس انقلابِ عظیم کے پس منظر کا تجزیہ کرے گا اور اس کی نگاہیں اس داستانِ انقلاب کے پیچ و خم کا جائزہ لیں گی تو صاف نظر آئیگا کہ اس کشمکش انقلاب کا حقیقی آغاز اس کے ظہورِ نتائج سے بہت عرصہ قبل ہو چکا تھا۔ اس پس منظر میں کتنے ہی دیوانوں اور سرپھروں کی اُن حسرتوں اور ارمانوں کا رقص بیروانہ نظر آئے گا جو اندر ہی اندر تڑپ کر ختم ہو گئیں۔ تاریخ میں ان زعماء کے نام تو سنہری حروف میں لکھ دئیے گئے جو اس انقلاب کے محسوس و مشہود نتائج لے کر سامنے آئے۔ لیکن بہت کم نگاہوں نے ان دیوانوں کا سراغ لگانے کی ضرورت محسوس کی جنھوں نے سب

پہلے تند و تیز آندھیوں میں دیپ جلائے اور منزل کی تڑپ میں جل جل کر اس شمع پر قربان ہو گئے۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ ہم ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور کو اس کا حرفِ آغاز قرار دیتے ہیں۔ ہماری تحقیق ذرے ماضی کی طرف لوٹتی ہے تو ہم علامہ اقبالؒ کے ۱۹۳۰ء کے الہ آباد کے خطبۂ صدارت کو اس تحریک کا سرعنوان سمجھتے ہیں۔ اور اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا شاہکار ہے۔ اور مملکتِ پاکستان کا جیتا جاگتا نقشہ قائداعظم کے حسنِ تدبر کا پیکرِ محسوس ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پاکستان کے حصول و قیام میں ان مایہ ناز شخصیتوں کے مقامِ بلند پر کوئی حرف آئے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی کھلا اعتراف ہے کہ اقبالؒ و جناحؒ کے بغیر ہم شاید اس منزلِ مراد کو بھی کھو بیٹھتے اور ابدی غلامی میں دم توڑ کر رہ جاتے۔ یہ سب کچھ بجا اور درست ہے۔ لیکن ہم آج جس حقیقت کی نقاب کشائی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس برصغیر کے مسلمانوں کے قومی تشخص کا تقاضہ ۱۹۳۰ء سے بھی بہت پہلے ابھر چکا تھا۔ اور اس سے ایک طویل مدت قبل ہماری نشاۃِ ثانیہ کا وہ طائرِ پیش رس مائلِ پرواز ہو چکا تھا جس کے ذوقِ بال کشائی نے ایک صدی قبل، ہندوؤں کے مقابلہ میں یہاں کے مسلمانوں کے لئے ان کی جداگانہ منزل کی نشان دہی کر دی تھی۔

ہماری عظمتِ رفتہ کا یہ عظیم المرتبت داعی اور ہماری کشمکشِ انقلاب کا یہ طائرِ پیش رس سرسید علیہ الرحمۃ تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہولناک نتائج سے اپنی قوم کو بچانے کیلئے آگے بڑھا اور بیگانوں کی مخالفت تو ایک طرف خود اپنی ہی قوم کے مذہبی پیشواؤں کی تند و تیز آندھیوں میں سفینۂ ملت کی ناخدائی کا فریضہ بے مثال عزم و ہمت اور جرأت و استقلال سے سرانجام دیتا رہا۔ سرسید کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ ایک مثالی شاہکار قرار پائیگا اور ہر حقیقت پسند یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ اگر سرسیدؒ نہ ہوتے تو ہمارا بیش بہا سرمایۂ ملی یقیناً اقبالؒ و جناحؒ جیسے گہر ہائے آبدار سے محروم ہوتا۔ یہ تمام درخشاں ستارے جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہمارے مطلعِ تقدیر پر ابھرتے اور جگمگاتے چلے آ رہے ہیں لاریب کہ یہ ان قومی تعلیمات کی اشاعت کا نتیجہ ہیں جن کی تحریک سرسیدؒ کی مومنانہ فراست اور حسنِ تدبر کے صدقے میں آغاز پذیر ہوئی۔

آغازِ سفر سے پہلے

نشۂ آزادی میں سرمست پاکستانیوں کی نگاہوں کو آج ایک بار عہدِ رفتہ کی طرف لوٹا کر اس سانحۂ قیامت پر غور کر لینا چاہئے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکستِ فاش اور نامرادی و حرماں نصیبی کے بعد ان کی زندگی میں ابھرا تھا۔ جب غیر ملکی حکمرانوں کا جوشِ انتقام ان کے وجود تک کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جب انتقامی جذبات کی تندی میں "برادرانِ وطن" سے محبت کی پینگیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ تعلیمی و دفتری نظام میں مسلمانوں کو اچھوتوں کی حیثیت دی جا رہی تھی اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے ذمہ دار

انگریز اپنی قوم میں ایسے لٹریچر کی اشاعت میں سرگرم کار تھے جس کی رُو سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جب تک اس برصغیر کے ایک ایک مسلمان کو گولی سے نہیں اُڑا دیا جائے گا انگریز امن وچین سے حکومت نہ کر سکے گا۔

یہ تھے وہ حالات جب کہ سرسیّد کی نگہ دوررس نے اپنی قوم کو ابدی ذلّت، شکست اور موت سے بچانے کا دو ٹوک حل تلاش کر لیا اور یہ حل تھا مسلمانوں کے لئے اُن کے تقاضائے ملی کی مناسبت سے قومی تعلیمات کا الگ انتظام۔ سرسیّد اس کے لئے سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۳ء میں "سائنٹیفک سوسائٹی" کی تاسیس عمل میں لائے۔ اور اس کی وساطت سے فلسفہ وسائنس کے جدید ترین لٹریچر کو اپنی قومی زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر اس کی نشر واشاعت کے لئے سنہ ۱۸۶۶ء میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا اجراء کیا اور پھر ایک عظیم تر مقصد کیلئے اپنے جگر پاروں سمیت ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور اکتوبر ۱۸۷۰ء میں جب وہ واپس لوٹے تو "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ اس عظیم مقصد کی نشر واشاعت شروع کر دی جس کی خاطر یہ ساری ابتلائیں اور آزمائشیں قبول کی گئی تھیں۔ یہ عظیم مقصد تھا مدرسہ علی گڑھ کا قیام جو ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا اور بہت جلد علیگڈھ کالج اور پھر علی گڈھ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔

تاریخی اور مُبارک دِن

مدرسہ علی گڑھ کا قیام شاید سطح بین نگاہوں میں ایک معمولی درس گاہ کا قیام ہو جس سے کہیں بڑی درس گاہیں اُس وقت برصغیر کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھیں لیکن ایک نگہ بصیرت جانتی ہے کہ یہ ایک عام مدرسہ کی رسمِ تاسیس نہیں تھی بلکہ تحریک پاکستان کے اس ایوانِ استقلال کی پہلی اینٹ رکھی جا رہی تھی جسے آئندہ چل کر عالم اسلام کی امیدوں کا مرکز ومحور بننا تھا۔ اس لحاظ سے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کا دن ایک مدرسہ کا یوم تاسیس نہیں تھا۔ بلکہ یہ وہ مبارک ومسعود اور تاریخی دن تھا جس سے ہماری عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کی صبح بہار طلوع ہوتی۔ تاریخ کا ہر انقلاب عظیم سب سے پہلے قلب ونگاہ میں تبدیلی کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ خوش گوار اور خوش آئند تبدیلی صرف صحیح تعلیم سے رونما ہوتی ہے۔ ملک میں سینکڑوں مذہبی درس گاہیں موجود تھیں۔ خود انگریز حکمران ملک کے طول وعرض میں اپنی ضرورت کے پیش نظر سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال پھیلائے جا رہے تھے۔ لیکن ہمیں داعی انقلاب کی نگہ دوررس صاف طور پر یہ دیکھ رہی تھی کہ ملت اسلامیہ کے مرض کہن کا چارہ نہ مکتب مُلّا میں ہے نہ انگریز کے قائم کردہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے تقاضے ان کی نئی نسلوں کے لئے اپنی جُداگانہ قومی تعلیمات کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کا مبارک دن مدرسہ علی گڑھ کے قیام سے اسی تقاضائے ملت کا حقیقی جواب دے رہا تھا۔

مدرسہ علی گڑھ کے قیام سے سرسید نے جو شمع روشن کی تھی اس نے ایک دن علی گڑھ یونیورسٹی کی صورت

اختیار کرلی۔ اس شمع کی ضو فشانیاں چاروں طرف پھیلتی چلی گئیں اور ان کے صدقے میں برصغیر کے چپے چپے پر نئے چراغ روشن ہوتے گئے۔ یہ مسلمانوں کی اپنی درسگاہیں اور اپنے دارالعلوم تھے جہاں مسلمان طالب علموں کو جدید اور مروّجہ علوم کی روشنی بھی حاصل ہوتی تھی اور اسلامی تعلیمات کی صورت میں اپنے جداگانہ قومی تشخص کا جذبۂ احساس بھی دلوں میں نشو و نما پاتا تھا۔ قومی تعلیمات کی ان فضاؤں میں نوجوانانِ ملت کی عقابی روحوں کو ذوقِ پرواز ملتا رہا اور ان میں سے سینکڑوں نوجوان قوم کے مطلعِ تقدیر پر درخشندہ ستارے بن کر چمکے اور مایوسی اور شکست کی تاریک فضا میں عمل پر انگیز امنگوں سے یقین و اعتماد کی روشنی پھیلا دی۔

منزلِ مقصود

ایک ہنگامہ پسند قوم کے لئے مدرسہ علی گڈھ کا قیام شاید کوئی عظیم کارنامہ نہ سمجھا جائے لیکن ہمارے ایوانِ استقلال کی یہ پہلی اینٹ رکھنے کیلئے سرسید کو کیا کچھ کرنا پڑا اعلیٰ رؤس الاشہاد بتادے گا کہ معاملہ کسقدر اہم تھا۔ اس سنگِ بنیاد سے سرسیدؒ کی کس قدر مقدس آرزوئیں وابستہ تھیں اور اس کیلئے انہوں نے کن کڑی آزمائشوں کا سامنا کیا۔ اس مقصد کے لئے جب وہ انگلستان روانہ ہو رہے تھے تو اس روانگی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے نواب محسن الملک لکھتے ہیں:۔

> "جب سرسید انگلستان جانے کو تھے تو مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کرسکتا۔ انہوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا۔ کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری شروع کی۔ انہوں نے بارہا مجھ سے کہا کہ میرا مقصد پورا نہیں ہوسکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول وطرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرلوں۔" (حیاتِ جاوید)

سوچئے کہ کیا یہ سب کچھ ایک عام مدرسہ قائم کرنے کے لئے ہو رہا تھا یا اس مدرسے کے قیام سے ایسے بلند مقاصد پیشِ نظر تھے جو حالات کے دھارے اور تاریخ کے رُخ کو بدل دیں۔

نواب محسن الملک، آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے نام ایک مکتوب میں اُن مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "سرسید احمد خان ولایت گئے مگر اس مقصد سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے، انہی کے گھروں اور انہی کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہو اسے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت جاکر تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارتوں کی سیر کرتے ہیں، اور یہ حامئ دینِ اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا "خطباتِ احمدیہ" کی تصنیف میں منہمک تھا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا انگلستان جانا قوم کے لئے تھا، رہنا قوم کے لئے تھا اور پھر واپس آنا قوم کے واسطے۔ (ایضاً)

جہدِ مسلسل اور اسکا انجام

مدرسہ علی گڑھ کو اسلامیانِ برصغیر کی واحد قومی یونیورسٹی کے درجہ تک لے جانے کے لئے جو عظیم منصوبہ سرسیدؒ کے ذہن میں تھا اس کے لئے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی لیکن اس اولوالعزم انسان نے یہ سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے وہ برسوں تک جگہ بجگہ کشکولِ گدائی ہاتھوں میں لئے پھرا۔ ان کے احباب دیتے دیتے تھک گئے لیکن وہ مانگتے مانگتے کبھی نہ تھکتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک آرٹیکل میں لکھا تھا۔

"ہمارا حال تو اب یہ ہوگیا ہے کہ دوست بھی اب ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صُورت ہی اب سوال ہوگئی ہے میں نے ایک دوست سے کہا کہ ہماری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا ہے۔ سو اس لکھے کی بدولت مانگتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے" (حیاتِ جاوید)

اُن دنوں مذہبی طبقے نے چاروں طرف سے اس زعیم ملت پر کفر کے فتووں سے یلغار کر رکھی تھی لیکن سرسیدؒ کی آواز کام کر گئی۔ قوم نے اس کا دامن دولت سے بھر دیا اور اس خطیر رقم سے علی گڑھ میں کالج اور یونیورسٹی کی پرشکوہ عمارتوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی جھلک نگاہوں میں عود کر آتی تھی ملک کے ایک ممتاز مسلمان نے علی گڑھ یونیورسٹی کے اس حسین و جمیل سلسلۂ تعمیر کو دیکھ کر کہا تھا کہ۔

خراجِ تحسین

"جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی وہ کام کر جاتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہوسکتے" (حیاتِ جاوید)

ایک ایرانی سیاح نے ان عمارات کو دیکھا تو وفورِ مسرت سے جھومتے ہوئے بے ساختہ اسکی زبان سے نکلا

"واللہ اعجزہ می نمائید۔ کاریکہ از سلطنت بر نیاید چگونہ از یک فرد رعیت انجام شد"

(حیاتِ جاوید)

برطانوی تعلیمی کمیشن کے چیرمین مسٹر ہارڈ نے ایک ایڈریس کے جواب میں سرسیدؒ کو اس کارنامہ پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"جس وقت میں نے کمروں کی اُن قطاروں کو دیکھا جو مکمل ہونے کے بعد دنیا میں اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارتیں ہوں گی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر نئی ہمت پیدا نہ ہو"

۱۸۷۶ء میں یہ کام ابھی ابتدائی منزل میں تھا لیکن دوربین نگاہیں اس حُسنِ آغاز کا انجام جمیل دیکھ رہی تھیں چنانچہ اس سال جب گورنر یو۔پی سرجان اسٹریچی یہاں سے انگلستان کو رخصت ہونے تو انہوں نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا کہ

"سب سے بڑا اور آخری کام جس میں انہوں نے (سرسید نے) اپنی زندگی اور وسائل کو وقف کیا یعنی اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور ان کی ترقی ..... یہ وہ کام ہے جس کے بعض نتائج کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مجھے قطعاً شبہ نہیں کہ یہ نتائج آئندہ زمانے میں اور بھی عجیب و غریب صورت اختیار کریں گے۔" (حیاتِ جاوید)

سر انتھونی میکڈانلڈ نے اس دانش گاہ ملی کے درخشندہ اور تابناک مستقبل کی شہادت دیتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ امید کرنا قطعاً مبالغہ آرائی نہیں کہ یہ کالج ترقی پا کر مسلمانوں کی بہت بڑی انسٹی ٹیوشن بن جائیگا اور دنیائے مشرق کا قرطبہ ثابت ہوگا۔" (ایضاً)

علی گڈھ نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں کس قسم کا معرکہ سرانجام دے گا اس کا جواب برطانوی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن مسٹر کیتن سے سنئے جو ان دنوں ایک فلاحی پروگرام کے سلسلے میں تبلیغی مشن پر نکلے تھے۔ اور اپنی تصنیف (PICTURESQUE INDIA) میں انہوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

"یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں گے وہ قدیم تصورات پر جدید علوم کا پیوند لگائیں گے اور ماضی کی طرف دیکھنے والوں کو حال کے تقاضوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کریں گے۔"

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں کہ:۔

"قوم کی امیدیں اس انسٹی ٹیوشن سے وابستہ ہیں، یہ ایک عظیم کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے میدان میں ایک ایسی قوم سے برسرِ کار آئی ہے جس میں تقدیر پر بھروسہ کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست کر دیئے تھے۔"

مشہور فاضل انگریز سر آکلینڈ کالون نے اس زعیم ملت کی وفات پر کس قدر درست کہا تھا کہ۔

"جس شخص کو آج آپ رو رہے ہیں یاد رکھئے کہ وہ اس قدر مخلص تھا کہ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ اور نہ مرنے کو لیکن وہ آپ کے لئے ایک گراں مایہ خزانہ چھوڑ گیا اور یہ نشانِ منزل دے گیا کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ جنگ جاری رکھو۔"

سرسید کی اسی عظمتِ کردار پر برادرانِ وطن کو رشک آرہا تھا۔ چنانچہ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ نے اپنی ایک تحریر میں اس فاضل ہندو لیڈر کا ذکر کیا ہے جس نے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

"ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں۔ تعلیم میں فائق ہیں، تعداد میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ لیکن ہم میں کوئی سرسید نہیں۔ بلکہ ہم سب مل کر بھی ایک ہو جائیں تو سرسید کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔"

مذہبی پیشوائیت کا تخریبی محاذ

یہ تھا عظیم سرسید اور یہ تھا اس کا علی گڈھ۔ دنیا کی نامور شخصیتیں

اس کی عظمتِ کردار کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھیں۔ ہمسایہ قوم کے فاضل رہنما اپنے دلوں میں یہ حسرت لئے ہوئے تھے کہ اے کاش! ان میں بھی کوئی سرسید ہوتا۔ لیکن سرسید کی اپنی ملت کے اجارہ دار اس پر تکفیر کے تیروں کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور پورے جوش و خروش اور غیظ و غضب میں یہ "فریضہ" سرانجام دے رہے تھے کہ قوم کی نشاۃ ثانیہ کی جہدِ مسلسل ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے۔ اس فتوے کے الفاظ پر غور کیجئے جس پر یہاں کے ساٹھ مفتیانِ عظام کے علاوہ مکہ و مدینہ کے مذہبی اکابرین کی مہر تصدیق حاصل کی گئی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"یہ شخص ضال اور مضل ہے۔ بلکہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بڑھ کر ہے۔ واجب ہو اولی الامر پر اس سے انتقام لینا (حیات جاوید)

مدینہ کے مفتی احناف شیخ محمد امین بابی نے متعلقہ استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا کہ۔

"یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے اس سے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے۔ ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔ اور ولایت الامر پر واجب ہے کہ ایسا کریں (ایضاً)

دارالعلوم علی گڑھ کے متعلق مولوی کریم اللہ دہلوی فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ

تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلباء کی بالکل باطل، اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے۔ اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے..... بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں ساعی ہونا ہمیہ اور حطب بننا لازم..... نے یوں سمجھئے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں" (ایضاً)

اسی دارالعلوم کے متعلق مدینہ منورہ کے مفتیوں کا فتویٰ سنئے لکھتے ہیں:-

"یہ مدرسہ جس کو خدا برباد کرے اور اس کے بانی کو ہلاک کرے۔ اس کی اعانت جائز نہیں۔ اگر مدرسہ تیار ہو جائے تو اسے منہدم کرنا اور اس کے بانی اور مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے (ایضاً)

وہ تھا کافر ملحد اور زندیق (معاذ اللہ) سرسید کا کردار اور یہ تھا ہمارے مفتیانِ شرعِ مبین کا حسنِ اخلاق سوچئے کہ تاریخ نے کیا فیصلہ صادر کیا۔ سرسید کا نام ایک عظیم اور شہرہ آفاق زعیم ملت کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔ اس کی "کافری" نے ایک مردہ قوم کو زندگی عطا کی۔ اور ان فتویٰ بازوں کو کوئی جانتا تک نہیں کہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے۔ اگر ان کا کہیں ذکر آتا بھی ہے تو اس حیثیت سے کہ یہ سرسید عظیم جدوجہد کی راہ کس طرح مذہب

کا نقاب اوڑھ کر حائل ہوئے۔

مذہبی پیشوائیت کی یہ تخریبی روش ہر سچے داعی انقلاب کے خلاف ہر دور میں جاری رہی۔ دینِ حق کا ہر علم بردار جو عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے اپنی جان لڑاتا رہا، تکفیر کے ان تیروں کا شکار بنتا رہا۔ یہ پہلے سے ہوتا چلا آیا اور آج ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ کرنے والے اپنا کام کر گئے۔ قوم کی بگڑی بنا گئے۔ تاریخ کا رُخ بدل گئے اور تاریخ نے ان کی عظمتِ کردار کو اپنے دامن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ لیکن جو لوگ مذہبی تقدس کا لبادہ اوڑھ کر ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہے۔ انہیں قوم اور تاریخ کی بارگاہ سے رسوائی اور روسیاہی کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا۔

حقیقی داعیٔ انقلاب

گزشتہ ایک صدی کی تاریخ میں ہمارے ہاں کسی وقت بھی ہنگامہ پسند طالع آزماؤں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ لوگ قوم کے زعیم بن کر ہمیشہ قوم کے جذبات سے کھیلتے رہے۔ مذہب و سیاست، جس پہلو سے بھی بن پڑا انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے کچھ ہنگامے ضرور پیدا کر دیئے۔ لیکن ان ہنگاموں سے قوم کی توانائیوں کو ضائع کرنے کے سوا اور کوئی قابلِ ذکر مقصد پورا نہ ہو سکا۔ سرسید کی عظیم شخصیت ان ہنگامہ پسند زعماء سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ قوم کی تاریخی روایات کے شایانِ شان خارجی دنیا میں ایک اساسی انقلاب برپا کرنے کے لئے افرادِ ملت کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب کی کارفرمائی ناگزیر سمجھتے تھے۔ اس لئے جب انہوں نے عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے اپنی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا تو اس کا پہلا قدم یہی قرار دیا کہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنی آئندہ نسلوں کے لئے تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام کیا جائے۔

علی گڈھ نے قومی انقلاب کے اس اساسی تقاضا کی حسن و خوبی سے پذیرائی کی۔ قومی زوال اور شکست کی ان تہلکہ انگیزیوں میں جو ۱۸۵۷ء کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھیں وہ سب سے پہلے قوم کے احساسِ خودی اور انفرادیت کو نمایاں طور پر ہر فردِ ملت کے دل و دماغ میں جاگزیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ مقصد علی گڈھ نے پورا کر دیا۔ قوم کے ہزاروں نوجوان اس دعوتِ انقلاب کے علمبردار بن کر میدانوں میں نکل آئے جس کے لئے سرسید کو کبھی کوئی رفیقِ کار تک میسر نہ تھا۔ ان تعلیمی کانفرنسوں نے قلوب و اذہان میں ایک روشنی سی پیدا کر دی۔ قوم کا احساسِ خودی انگڑائیاں لینے لگا۔ فضا حرکت و عمل کے لئے تیار تھی اور بس اس حکیمِ انقلاب کا انتظار تھا جو اس کاروانِ شوق کو اس کی منزل کے سراغ سے بہرہ ور کرتا۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں یہ سعادت اقبال کے حصے میں آئی۔ انہوں نے ببانگِ دہل اپنے قافلے کو نشانِ منزل کی خبر دی اور جب قائدِ اعظمؒ نے سالارِ انقلاب کی حیثیت سے اس قافلے کی عنانِ قیادت اپنے ہاتھوں میں لی تو سرسید کا علی گڈھ بن کر میدان میں آ گیا اور تحریکِ پاکستان کو منزلِ مراد تک پہنچانے میں وہ تاریخی کارنامے سرانجام دیئے۔ جن کی شہادت تاریخ کے زرّیں اوراق دے رہے ہیں۔

نئی منزل اور نئے تقاضے

اگست ۱۹۴۷ء میں تحریک علی گڑھ کا مشن حاصلِ تکمیل کو پہنچ گیا۔ سرسید قوم کے بڑھتے ہوئے قدم جس منزلِ مُراد تک گامزن دیکھنا چاہتے تھے وہ منزل خود قدم لینے کو آگے بڑھ آئی۔ اس کے بعد جو منزلیں سامنے آرہی تھیں۔ ان کے تقاضے پہلے سے مختلف نوعیت کے تھے۔ علی گڑھ نے حصولِ پاکستان کی تحریک میں اپنا فریضہ کامیابی سے پورا کر دیا لیکن اب سوال قرآنی خطوط پر اس مملکت کی تشکیل کا تھا۔ ویسے بھی برصغیر کے نئے خاکوں میں علی گڑھ کا رشتہ پاکستان سے کٹ کر رہ گیا اور علی گڑھ کی روح کو کچلنے میں مہاسبھائی ذہنیت جو ہتھکنڈے بروئے کار لاتی چلی آئی اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ علیگڑھ اس نئی مملکت کی تشکیل میں ہمارا ہاتھ بٹا سکے۔ علی گڑھ کی قومی تعلیمات کا یہی کارنامہ کچھ کم نہیں تھا کہ اس نے ہمیں اس منزل تک پہنچانے میں بہترین اسباب و وسائل مہیا کئے۔ اب اس نئی دنیا، نئی فضا، نئے ماحول اور نئے تقاضوں میں ملّت پاکستان کو ایک نئے سرسیدؒ اور "نئے اقبال" کی ضرورت تھی اور اسے مبدائے فیض کی کرم گستری سمجھئے کہ ایسے اسلاف کا جانشین ہمیں اس مفکر قرآن کی صورت میں بروقت مل گیا جسے پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں پرویز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کے ہاتھوں میں ۱۹۳۸ء میں خود مفکر اقبالؒ نے طلوعِ اسلام کا ننھا سا دیا تھما دیا اور قرآن کا یہ شہرۂ آفاق طالب علم گزشتہ ستائیس برس سے تند و تیز آندھیوں میں بحفاظت تمام اس چراغ کو منزل بمنزل آگے بڑھائے چلا آرہا ہے تاکہ اس منزل کے راہی کہیں سر راہ ٹھوکر نہ کھانے پائیں اور اُن کی راہیں اس فکر قرآنی سے روشن رہیں جو طلوعِ اسلام کی وساطت سے چاروں طرف اپنی کرنیں پھیلاتے چلی آرہی ہے۔

معرکۂ دین و وطن

۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے پرچم تلے قومی جد و جہد کا نیا محاذ تحریکِ پاکستان کا رُخ کر رہا تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ اس تحریک کے مقابلے میں وہ مذہبی پیشوائیت ہراول دستہ بن کر آئیگی جو وارِدھا آشرم اور آنند بھون کو اپنا کعبۂ مقصود بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے چند ہی ماہ قبل اس مذہبی پیشوائیت کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے وطنی قومیت کا نعرہ بلند کر کے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر وہ معرکۂ دین و وطن سامنے آیا تھا جس میں بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے حکیم الامت اقبالؒ نے مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے اس گمراہ کن نظریہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں اور اب یہ خطرہ واضح تھا کہ ان نیشنلسٹ مُقدسین کے ناقوس خصوصی روزنامہ "الجمعیۃ" مدینہ بجنور "زمزم" اور دیگر اخبارات، مذہب کی آڑ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک پر کیچڑ اچھالنے میں کوشاں ہوں گے۔ ملّت کے اجتماعی عزم کے خلاف مذہبی پیشوائیت کی اس یلغار کو روکنے کے لئے "طلوعِ اسلام" کا اجرا ہوا۔ اور تحریکِ پاکستان کو تقاضائے دین قرار دیتے ہوئے فکرِ قرآنی کے اس نقیب نے جس طرح ہر محاذ پر نیشنلسٹ مسلمانوں کے ترجمان اخبارات کی کانگریس نوازی کے تار و پود بکھیرے اسے تحریکِ پاکستان کے ایک مستقل باب کی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبالؒ کے سانحۂ رحلت کے بعد جب مولانا حسین احمد مدنی

نے از سرِ نو معرکۂ دین و وطن کا آغاز کرنے کی جرأت کی تو یہ طلوعِ اسلام ہی تھا جس نے اقبالؒ کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے ان تنکوں کے پلوں کو بہا کر رکھ دیا۔ جو مولانا مدنی مرحوم نے اپنے بیان کے ذریعہ تعمیر کرنے کی سعی ناکام کی تھی۔ تحریک پاکستان کے خلاف "ان مقدسین کانگریس" کی یہ یلغار اس قدر شدید تھی کہ اگر اس کے جواب میں طلوعِ اسلام بصیرتِ قرآنی کا اس قدر موثر مظاہرہ نہ کرتا تو عین ممکن تھا کہ ان حضرات کی مقدس نقابوں میں لپٹی ہوئی مذہبی تاویلات دس کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کو خاسر و ناکام بنا کر رکھ دیتیں اور مسلمان جبہ و دستار کی مقدس بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتے۔

تحریک پاکستان اور طلوع اسلام

لیکن طلوعِ اسلام نے اس مقدس نقاب کا ایک ایک تار بکھیر کر رکھ دیا اور پوری ملت کو ذہن نشین کرا دیا کہ اسلام کے نام پر جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، یہ اسلام کی ترجمانی ہرگز نہیں بلکہ وار دھا آشرم کے مہاتماؤں اور آنند بھون کے پنڈتوں کی اشیرباد حاصل کرنے کی ایک ایسی گھناؤنی سعی و کاوش ہے جس کا مقصد ملتِ اسلامیہ کو اس کی منزلِ مراد سے محروم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ طلوعِ اسلام کی اس ضربِ کلیمی نے مذہبی پیشوائیت کے تراشیدہ وطنی قومیت کے بُت اس جرأت سے پاش پاش کئے کہ اس کے گہرے زخم آج تک اس کی آتشِ انتقام کو بھڑکاتے ہوئے ہیں اور قیامِ پاکستان کے بعد اس انتقامی روش نے کوئی موقع ضائع نہیں کیا ہے کہ مقدس نام پر کوئی بدترین حربہ ایسا نہیں جو اس نے طلوعِ اسلام کی تحریکِ قرآنی کے خلاف اختیار نہ کیا ہو۔ افتراپردازیوں اور بہتان طرازیوں کا کوئی فتنہ نہیں جو عوام کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے اس کے خلاف بروئے کار نہ لایا گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام حربے جو اسی پیشوائیت نے سرسید کے خلاف استعمال کئے تھے اب پرویز کے خلاف استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوگا وہ بھی ظاہر ہے۔ اگر کل سرسیدؒ کے تحمل اور بردباری نے ان اشتعال انگیزیوں کو خاسر و ناکام بنا کر رکھ دیا تو آج بھی انہیں اسی نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ قرآن کی عالم آرا دعوت و انقلاب کے مقابل خود ساختہ مذہب کے لات و ہبل بالآخر زمیں بوس ہو کر رہیں گے، یہ خدا کی وہ سُنّت ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی۔ اور یہ تاریخ کا وہ اٹل فیصلہ ہے جو ہر دور میں دہرا گیا ہے۔

پاکستان اور قرآنی نظام

آج مملکتِ پاکستان کو ایک نظام کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے محکم، پائیدار اور عالم آرا نظام کی جس کی بدولت جنتِ ارضی کی بساط بچھ جائے۔ یہ نظام صرف قرآن کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ اس قرآنی نظام میں نہ مذہبی فرقہ بندی باقی رہ سکتی ہے اور نہ سیاسی پارٹیوں کا وجود۔ خدا کے دین میں صدیوں سے پیدا کردہ یہ سارا انتشار عین شرک کے مترادف ہے۔ اور قرآنی نظام کے سوا اسے کوئی دوسری تدبیر حل نہیں کر سکتی۔ اس نظام میں سلطانی و ملائی و پیری کے جذام اور سرسام سے نوعِ انسانی کو کلیتہً نجات مل جاتی

ہے۔ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت سے ہر نوع غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر رہ جاتی ہیں اور ہر انسان سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس نظام میں دولت و پیداوار کے سرچشموں پر کسی فرد یا گروہ کی اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ کوئی فرد دوسروں کی خون پسینے کی کمائی پر عیش نہیں لوٹ سکتا۔ اور ہر انسان کا حق لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے اصول پر طے پا جاتا ہے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصود

طلوع اسلام کی تحریک۔ پاکستان میں اسی قرآنی نظام کے قیام و دوام کے لئے کوشاں ہے۔ اسی مثالی نظام کی تکمیل کے لئے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا۔ لیکن اس نظام کو جبراً نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ بلکہ افرادِ مملکت کو علیٰ وجہ البصیرت اس کی برکات و حسنات کو سمجھنے کے قابل بنایا جائے گا اور یہ قرآنی تعلیمات کو عملاً رائج کئے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں وہی راہ اختیار کرنی ہوگی جو سرسید نے مدرسہ علی گڈھ کا آغاز کرتے ہوئے اختیار کی تھی۔ علی گڈھ کی قومی تعلیمات کا منشاء و مقصود ہماری نئی نسلوں کو ان علوم سے بہرہ ور کرنا تھا جو انہیں شعوری طور پر حالات کے تقاضوں اور وقت کے چیلنج کا سامنا کرنے کے قابل بنا سکیں۔ اور آج جب کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان تقاضوں نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا ہے اور مملکت میں ایک نئے نظام کی تشکیل کا پہلا مرحلہ کئی برسوں سے سب کے سامنے ہے اسے حسن و خوبی سے طے کرنے کے لئے قرآن کی تعلیمات نئی نسلوں کے سامنے لانی پڑیں گی۔ وقت اور حالات کی یہ وہ ناگزیر ضرورت ہے جسے پورا کئے بغیر تحریک پاکستان کے منشاء و مقصود کی تکمیل ممکن نہیں۔

یہاں ایک لمحہ رک کر ہمیں وہ حقیقت اپنے ذہنوں میں پھر تازہ کر لینی چاہئے جس کی خاطر پاکستان کی جنگ لڑی گئی۔ اور اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا۔ اس خطہ زمین میں کس قسم کا نظامِ مملکت قائم کرنا مقصود تھا اسے خود بانیٔ پاکستان کے الفاظ میں سامنے لائیے۔ مارچ ۱۹۴۸ء سے تحریک پاکستان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس سے اگلے ہی سال ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو قائداعظم عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں تشریف لے گئے اور وہاں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے دو ٹوک اور متعین الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ

> "اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے اور نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ ایک مملکت کی ضرورت ہے۔"

یہ تھی بانیٔ پاکستان کی زبان سے اس مقصدِ عظیم کی وضاحت جس کے لئے مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت کے حصول کی

جدوجہد شروع ہوئی تھی۔ صاف اور واضح ہے کہ بانئ پاکستان کے نزدیک پاکستان میں قرآنی اصول و احکام کے علاوہ نہ کسی بادشاہ کی حکمرانی قائم ہو سکتی ہے اور نہ کسی پارلیمان یا دوسرے ادارے کی۔ اسی مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ۔

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اسوقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام میں مجدّد ہوگا اور وہی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن بھی ہوگا۔ .... افسوس کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔ میری ناقص رائے میں اسلام اسوقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شائد اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ ..
>
> (اقبال نامہ۔ جلد اول ص ۵۰)

اقبالؒ و جناحؒ کے الفاظ میں یہ تھے وہ عظیم ترین تقاضے جن کی بجاآوری اس مملکت میں پہلے دن سے مقصود تھی یعنی۔

۱۔ اس مملکت میں خالص قرآنی اصول اور احکام کی کارفرمائی۔ اور

۲۔ احکام قرآنیہ کی ابدیت کو علیٰ وجہ البصیرت ثابت کرنا اور انہیں عملاً متشکل کرنے کی جدوجہد کرنا۔

اس منتہیٰ و مقصود کو پیشِ نظر رکھئے۔ گزشتہ سترہ اٹھارہ برس کی تاریخ کا جائزہ لیجئے اور پھر ایمانداری سے اس تلخ حقیقت پر غور فرمایئے کہ اس عظیم مقصود و منتہیٰ کی خاطر جس کی راہ میں ہم نے ایک دنیا سے لڑائی مول لی اور قدم قدم پر گہرے زخم کھائے، ہم نے کیا کچھ کیا۔ حکومت ہو یا عوام، اربابِ سیاست ہوں یا مذہبی پیشوا۔ کیا کسی گوشے میں بھی ایسی سعی و کاوش کا کوئی ثبوت ملے گا جو احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرنے اور پاکستان میں ان کی کارفرمائی کا امکان پیدا کرنے کے لئے بروئے کار لائی گئی ہو؟ سکولوں کے لئے دینیات کے نصاب مرتب ہوتے رہے مذہبی درسگاہوں کا سلسلہ بڑھانے کے لئے لاکھوں روپوں کی چندہ بازی ہوتی رہی۔ لیکن کیا کوئی بتائے گا کہ ان اسکولوں، کالجوں اور درسگاہوں میں اس تقاضائے دین و ایمان کو پورا کرنے کے لئے کوئی ایک آدھ قدم بھی موثر طور پر اٹھا؟ نہیں بلکہ لاکھوں کے اس صرفِ عظیم سے دینیات کے نام پر جو کچھ ہمارے طالب علموں کو پڑھایا جاتا ہے اس کا کوئی ادنیٰ تعلق بھی ان تعلیمات قرآنی سے ہے جو قرآنی احکام کی ابدیت کو واضح کر سکیں اور انہیں مملکت میں عملاً متشکل کرنے کا ذرا سا امکان روشن ہو؟

صرف ایک آواز

ان اٹھارہ سالوں میں صرف ایک ہی آواز تھی جو رجعت الی القرآن کا نعرہ بلند کرتی رہی قرآن کے ابدی حقائق کو ابھار اور نکھار کر منظرِ عام پر لاتی رہی یہ مفکرِ قرآن محترم پرویز کی شخصیت تھی جس نے اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور اس راہ میں دن رات ایک کر دیا جس کے قلبِ مضطرب کی بے تابیاں اور دیدۂ تر کی بے خوابیاں، جس کی آشفتگیاں اور آرزوئیں، دعائیں اور امیدیں ہر آن اس مقصدِ عزیز

پر مرکوز رہیں۔ جس کی فکر و بصیرت نے کتابِ خداوندی پر پڑے ہوئے سازش عجم کے ایک ایک نقاب کو اٹھا، جس نے عصرِ حاضر کے تقاضوں کا حل قرآن کی زبان سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس نے خون کے گھونٹ پی پی کر اپنوں اور بیگانوں کی بدترین افترا پردازیاں اس راہ میں گوارا کیں۔ لیکن اقبالؒ و جناحؒ کی روح کی پکار پر شب و روز اس جنون میں سرگرم کار رہا کہ پاکستان میں قرآنی نظام کی صبح بہار جلد طلوع ہو اور اس کی جلوہ باریوں میں جنت سے نکلا ہوا آدم پھر اپنی فردوسِ گم گشتہ کو پالے۔

یہ ایک فرد جو اپنی ذات میں پوری ملت کو سموئے ہوئے ہے قرآن کی انقلابی آواز برابر بلند کئے چلا آ رہا ہے۔ اس کی آواز اب ایک فردِ واحد کی آواز نہیں رہی بلکہ ملت کے سینکڑوں سلیم بیٹے اور طاہرہ بیٹیاں اس آواز کو تقاضائے ایمان سمجھ کر اسے لبیک کہہ رہی ہیں۔ اس شمع قرآنی کے گرد پروانوں کا ہجوم ہے اور یہ مردِ درویش اسے مخالفت کی تند و تیز آندھیوں میں بحفاظت تمام برابر جلائے چلا جا رہا ہے۔ اس کی تمنا ہی تو اب بیرونِ پاکستان بھی سینکڑوں پروانوں کو تعاون کی دعوت دے رہی ہے اور یہ پروانے اس روشنی کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں جو چودہ برس قبل حضور رسالتمآبؐ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مبارک ہاتھوں سے روشن ہوئی اور عرب و عجم کی بسیط پہنائیوں کو زندگی کی بھرپور سعادتوں سے مالا مال کر گئی۔

سرسیدؒ نے قوم کی بگڑی بنانے کے لئے یہ ناگزیر سمجھا تھا کہ افرادِ ملت کے قلوب و اذہان کی تربیت کا خصوصی اہتمام ہو اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قوم کی نئی نسلوں کے لئے ایسی درسگاہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو انہیں اپنے مقام سے آگاہ کر سکے اور رہگذرِ حیات پر اپنی حقیقی منزل تک پہنچنے کا شعور عطا کرے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے الفاظ میں یہ تھا کہ

> وہ (سرسید) علی گڑھ کو مسلم لیڈرشپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ درسگاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسید کی دوربینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے، اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیطِ کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پروگراموں کی بجائے وہ پروگرام دینے والے پیدا کریں جو حالات کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ ہند کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا۔۔۔۔ چنانچہ علی گڑھ کو انہوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور بیداری و رہبری کی جو لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وہ برعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہنچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔ (مقالہ۔ سرسید احمد خاں پر ایک نظر)

دانشگاہِ قرآنی کی تاسیس

حالات کے نئے تقاضوں نے اب پھر اسی مقصد کے تحت ہمارے دروازوں پر دستک دی ہے اور وہ وقت آ گیا ہے کہ قرآن کی دعوتِ انقلاب اپنے مرکز

تربیت کا قیام عمل میں لائے۔ پرویز کی بصیرتِ قرآنی کا سلسلہ اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں ان کی دعوتِ انقلاب ہزاروں سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کا سرمایۂ دین قرار پا جائے اور جو کام انہوں نے سالہا سال قبل تنِ تنہا شروع کیا تھا، اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور ملّتِ پاکستان کے وحدتِ خیال کا مرکز بن جانے کا امکان روشن ہو۔ قرآنی فکر و بصیرت کا یہ بیش بہا سرمایہ نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ضامن بن جائے اور اس روشنی کے عام پھیل جانے سے یہ انقلابِ عظیم کے تقاضے حسنِ انجام کو پہنچیں جو تحریکِ پاکستان کا آئینہ دار تھا اور ملّتِ اسلامیہ کے مستقبل کی روشن تقدیر۔

دانش گاہِ قرآنی (طلوعِ اسلام کالج) کے قیام کا فیصلہ انہی مقدّس آرزوؤں کا پیکرِ جمیل بن کر ملّتِ پاکستان کے سامنے آ رہا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے کم و بیش ایک صدی بعد یہ اپنی نوعیت کی پہلی درس گاہ ہوگی جو حالات کے تقاضوں کی بجا آوری کا سامان مہیا کرے گی۔ قرآن کی آواز، قرآن کا پیغام، قرآن کے حقائق، قرآن کے اصول و اقدار اور قرآن کے قوانین و احکام، اور یہ سب کچھ قرآن کی اپنی تعلیمات کی روشنی میں۔ سوچئے کہ اس درس گاہ سے کس قدر صالح انقلاب ہماری قومی زندگی میں ابھرے گا۔ سرسیّد کی طرح شاید پرویز بھی اپنی خونِ جگر سے سینچی ہوئی اس کشتِ نوبہار کے برگ و بار دیکھنے تک کا انتظار نہ کر سکے لیکن قرآنی تعلیمات کا یہ تخمِ صالح جو نئی نسلوں کے قلب و نگاہ میں قرار پکڑے گا، وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ یقیناً برگ و بار لائے گا۔ اس کی ننھی ننھی کونپلیں ایسے لہلہاتے ہوئے شجرِ طیّب میں تبدیل ہو جائیں گی جس کی ثمرباریوں سے عالمِ انسانیت کا گوشہ گوشہ فیض یاب ہوگا۔ اس طرح ہوگا کہ یہ کسی فرد یا گروہ کی ذاتی فکر و کاوش کا معجزہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کتابِ عظیم کا فیضِ عام ہوگا جو صدیوں قبل حیاتِ انسانی میں جنّتِ ارضی کا نقشہ قائم کر گئی اور اب صدیوں سے ریشمی غلافوں میں لپٹی پڑی ہے۔ اسے کھولا جاتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کے بابِ عالی سے اپنے پُر پیچ مسائل کا حل تلاش کیا جائے بلکہ "حصولِ ثواب" کی خاطر۔

دانشگاہِ قرآنی اس کتابِ عظیم کو ان غلافوں سے نکال کر منظرِ عام پر لائے گی۔ اس کے ابدی حقائق پر سے صدیوں کے نقاب الٹ دیئے جائیں گے اور اس کی ایک ایک آیت زبانِ حال سے پکار پکار کر بتائے گی کہ نوعِ انسانی کی منزلِ مقصود کیا ہے اور اس کتاب کے صدقے میں اقوامِ عالم کی امامت کا فریضہ کس حسن کارانہ انداز سے سرانجام پاتا ہے۔ ہاں یقیناً

آئے گی نیض ایک دن بادِ بہار لے کر
تسنیم مے فروشاں پیغامِ مے گساراں

یہ امر کس قدر موجبِ مسرت و تہنیت ہے کہ آج جب کہ ہم مدرسہ علی گڑھ کے یومِ تاسیس کے نوّے سال کے بعد اس کی یاد تازہ کر رہے ہیں، پرویز صاحب کی زیرِ نظر دانش گاہِ قرآنی کا منشور اس کی تفاصیل کیلئے وجہ نورانیتِ قلب و نگاہ بن رہا ہے جسے آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ درحقیقت ہم اس پیامِ بہار کے لئے ایک مدت سے پیکرِ انتظار تھے۔

باسمہٖ تعالیٰ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

دین و دانش کا حسین امتزاج

قوموں کا مستقبل انکی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان، اسی قسم کی کل کی قوم اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصول پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضے سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کونسی ہے جس کی ہم اس قدر شکایت کرتے رہتے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو تشکیل پاکستان کے وقت ہماری درس گاہوں میں زیر تعلیم تھے۔ وہی طالب علم سولہ سترہ برس کے بعد اب ہماری قوم کا ہوش مند طبقہ بن گئے ہیں اور انہی کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا بھی روتے ہیں اور اس کے ساتھ، ہر سال اس قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی جو نوجوان ہماری درس گاہوں سے غلط تعلیم حاصل کرکے باہر نکلتے ہیں وہی ہماری قوم کے اجزا بنتے ہیں۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

۲۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچہ میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم الگ کھولے جائیں اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے۔ یا ایم اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر دیا جائے ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جسے

علامہ اقبال نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات۔ تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا۔ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ۔

فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحی خداوندی کی روشنی میں نوع انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی تعیین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی مشرقِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔

۳۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے درس گاہ کی ضرورت ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس پر اپنے زمانے میں پاکستان کے معمارِ اول سرسید علیہ الرحمۃ پہنچے تھے اور انہوں نے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی بنیاد رکھی تھی جس کے نتائج بعد کی نسلوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے۔ اب ہمارے حالات کا تقاضہ ہے کہ ایک جدید درس گاہ کی بنیاد رکھی جائے جس کا مقصد وہ ہو جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لئے تجویز یہ ہے کہ سردست ایک کالج کھولا جائے جس میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدہ کے مطابق ہو تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالب علم، زندگی کے کسی شعبے میں دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے اور اس کیلئے مختلف میدان دوسرے طالب علموں کی طرح کھلے ہوں۔ لیکن اس کالج میں مضامین اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلباء کو ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ ان میں کونسی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور قرآنِ کریم اس باب میں کیا نقطۂ نگاہ پیش کرتا۔ علاوہ ازیں انہیں قرآنِ کریم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ۔

(۵) پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی، اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ، قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کونسی

کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستہ پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے اور

(۱۱) دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی معاشرتی۔ سیاسی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے ان کا علم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے قرآن کریم ان مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نقطۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی راہ نمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال پیش کر سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں اور سیرت نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ کے رکھ لیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تربیت کے لئے کالج کے ساتھ ہوسٹل کا ہونا بھی ضروری ہے یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ایک جدید طرز کی درس گاہ کے قیام کا پروگرام سامنے رکھا گیا ہے۔ سر دست تجویز یہ ہے کہ اس کی ابتدا ایف۔ اے (سال اول) سے کی جائے اور اسے سال بہ سال آگے بڑھاتے چلے جائیں اس کے بعد ابتدائی اسکولوں کی بنیاد رکھی جائے۔ تاکہ شروع ہی سے بچوں کی تعلیم اس نہج پر ہو۔ درس گاہیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے قائم کی جائیں اور جب یہ سلسلہ پھیل جائے تو اس کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انہی درسگاہوں میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح یہ درس گاہیں ملک کے عام نظام تعلیم کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں گی اور وہ نظام خود بخود اپنے آپ کو اس قالب میں ڈھال لے گا۔ اس سے پاکستان میں ایک نئی قوم تیار ہو جائے گی جو اس آئیڈیالوجی کی پیکر ہو گی جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

۴۔ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی ہے جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرا لیا گیا ہے۔ اس کی ایک ایگزیکٹو کمیٹی بھی متعین کر لی گئی ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقے سے ہے نہ سیاسی پارٹی سے۔ یہ خالص اسلام کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے اور فرقہ واری اور پارٹی بازی سے بلند رہ کر قوم کے نوجوان طبقہ کے دلوں میں صحیح اسلام کا تصور روشن کرنا اس کا نصب العین ہے۔

۵۔ یہ ہیں وہ عزائم جنہیں لے کر یہ سوسائٹی وجود میں آئی ہے۔ اور یہی تابناک عزائم سر دست اس کی متاع ہیں۔ اسے اس کا احساس ہے کہ یہ سکیم اپنی تکمیل کے لئے بہت بڑے ذرائع اور وسائل چاہتی ہے جو اس وقت اسے میسر نہیں۔ لیکن اسے امید ہے کہ قوم کے وہ دردمند افراد جو ملت کے سچے بہی خواہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی

نسلیں تباہی سے بچ جائیں اور ان کا وجود باعثِ فخر پاکستان اور وجہ شرفِ انسانیت ہو، وہ ہمارے عزم کو بروئے کار لانے کے لئے آگے بڑھیں گے اور ہر طرح سے ہم سے تعاون کریں گے۔

۶۔ جو حضرات اس اسکیم سے متفق ہوں اُن سے درخواست ہے کہ وہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ مالی امداد دیں اس مقصد کے لئے سوسائٹی کا حساب ۔۔ حبیب بنک۔ گلبرگ۔ لاہور ۔۔ میں کھول لیا گیا ہے۔ چیک

QURANIC EDUCATION SOCIETY (Regd)

کے نام سے کاٹے جائیں۔ سوسائٹی کی طرف سے ہر چھوٹی بڑی رقم کی رسید جاری کی جائے گی۔ اور وقتاً فوقتاً تمام عطیات کی تفصیل شائع کی جائے گی۔ پتہ حسب ذیل ہے:۔

حساب کتاب کے سلسلہ میں

(میرزا) محمد خلیل

خازن۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

دیگر امور کے سلسلہ میں۔

(شیخ) سراج الحق

سکرٹری۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور

آخر میں اسے پھر دوہرا دیا جائے کہ اگر یہ تعلیمی اسکیم عمل میں آگئی ۔۔ اور جب آپ ہمت کریں گے تو یہ عمل میں کیوں نہیں آئے گی ۔۔ تو اس سے ہماری قوم ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل جائے گا۔ اور اس میں حصہ لینے والے۔ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن ۔ کا نام زمانے کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا جس طرح سرسیّدؒ کا دارالعلوم حصول پاکستان پر منتج ہوا۔ چہ عجب کہ یہ نئی درس گاہ پاکستان کو ایک صحیح اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے کا موجب بن جائے۔ کتنی حسین ہے ہماری یہ آرزو۔ اور کیسا درخشندہ ہے اس کا مستقبل ۔۔ واللہ المستعان۔ علیہ توکلت۔ والیہ انیب

نیاز آگین

ارکان مجلس منتظمہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

غلام احمد پرویز (ڈائرکٹر قرآنک ریسرچ سنٹر۔ لاہور) ۲۔ (شیخ) سراج الحق (ریٹائرڈ ریلوے اوفیسر) ۳۔ (میرزا) محمد خلیل (ریلوے اوفیسر) ۴۔ (مس) شمیم انور (لیکچرار۔ کنیئرڈ کالج۔ لاہور) ۵۔ (ڈاکٹر سید) عبدالودود (فزیشن اینڈ سرجن۔ لاہور) ۶۔ (حاجی) محمد اکرم (ایڈووکیٹ۔ لاہور)

اپریل ۱۹۶۵ء ۲۵/بی گلبرگ (۲) لاہور

بچوں کا صفحہ

سرسید احمد خاںؒ

بچو! تم نے سرسید احمد خاںؒ کا نام سنا ہوگا۔ وہ بہت بڑے انسان اور بلند کیریکٹر کے مسلمان تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ جیسے لیڈر پیدا ہوگئے اور ہمیں پاکستان جیسی مملکت مل گئی۔ جب سرسیدؒ ابھی چھوٹے سے تھے تو اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی تربیت ان کی والدہ نے کی۔ یہ تربیت کس قسم کی تھی اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے جسے سرسیدؒ نے خود بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

"جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو خبر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں آیا تو انہوں نے ناراض ہوکر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور

سڑک پر لاکر چھوڑ دیا۔ اس وقت میری خالہ کے گھر سے، جو بہت قریب تھا، دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ انہوں نے کہا" دیکھو! آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ میں تم کو کوٹھے پہ ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا۔ ورنہ وہ ہم سے ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف فرمائیں۔ انہوں نے کہا۔ اگر یہ اُس نوکر سے قصور معاف کرائے گا۔ تو میں بھی معاف کردونگی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جاکر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہُوا۔

یاد رکھو بچو! دنیا میں بڑا وہی بنتا ہے جو اپنے سے چھوٹوں کی عزت کرتا ہے اور جب اس سے کوئی قصور ہو جاتا ہے تو اس کی معافی مانگ لیتا ہے۔

(باجی)

مُفت :- مجرب دوا برائے دمہ - درد گردہ - پتھری
ملنے کا پتہ :- حاجی محمد دین شیخ آئس فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی -
نوٹ :- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

جس طرح تاج محل آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے جس طرح آج سے تین سو سال پہلے۔ اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اسکی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے

محترم پرویز صاحب کی زندہ جاوید تصانیف

سلیم کے نام خطوط

انسان نے کیا سوچا؟

ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ انسان نے کیا سوچا!

قیمت بارہ روپے۔ سلیم کے نام خطوط (تین خوبصورت جلدوں میں) قیمت جلد اول آٹھ روپے۔ جلد دوم چھ روپے۔ جلد سوم:۔ چھ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ہندو کا علاج ہی یہی ہے

جولائی ۱۹۴۸ء کے طلوعِ اسلام میں (یعنی اب سے سترہ برس پہلے) جو لمعات شائع ہوئے تھے انہیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ان کا غور سے مطالعہ فرمائیے:۔

ہندوؤں نے سومنات کی جامع مسجد کو جسے ۱۰۲۴ء میں محمود غزنوی نے تعمیر کرایا تھا زبردستی مندر میں تبدیل کر لیا ہے اس موقعہ پر ہندوؤں نے بہت بڑا جشن منایا جس میں پولیس اور فوج نے بھی شرکت کی مسجد کے ۵ سالہ بوڑھے متولی کو باہر نکال دیا گیا اور خدا کے اس گھر میں بُت رکھ دیے گئے۔ اب مسجد میں ناقوس بجتا ہے اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے

(ڈان ۱۲ جون ۱۹۶۵ء)

یہ ایک مثال ہے استبداد اور قہرمانیت کی ان سینکڑوں مثالوں میں سے جو ہندوستان کی مزعومہ جمہوری حکومت، باایں ہمہ ادعائے محرّیتِ فکر و نظر اور آزادیٔ مذہب و مسلک، ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں پر بلا دریغ و بے محابا روا رکھ رہی ہے۔ ایک مسجد و معابد کا ذکر کیا کونسی شے ہے جو مسلمانوں کے نزدیک محبوب و محترم ہے اور اسے وہاں محفوظ و مصئون سمجھا جا سکتا ہے، جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، ناموس سب ان کے رحم و کرم پر ہے جنہیں۔

خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

یہی وہ فسادِ ملوکیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ ان الملوک اذا دخلوا قریۃً افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک یفعلون (۲۷/۳۴) جب کسی ایسی قوم کو حکومت مل جاتی ہے جو نشۂ ملوکیت سے بدمست ہو تو وہ عدل و انصاف کی تمام راہوں کو الٹ دیتی ہے اور عزت و شرافت کے پیکروں کو ذلیل و خوار کرنے میں لات لیتی ہے۔ وکذالک یفعلون۔ یعنی یہ کسی ہنگامی واقعہ کی طرف اشارہ نہیں جو زمانہ قدیمہ میں کبھی گزر چکا ہو۔ بلکہ یہ خاصۂ ملوکیت ہے، یہ قوتِ بے زمام کی فطرت ہے۔ ملوکیت ہمیشہ یہی کرتی چلی آ رہی ہے۔ اور یہی کرتی چلی جائے گی۔ وکذالک یفعلون اور جب حکومت و سطوت کسی ایسی قوم کو مل جائے جو ہمیشہ غلام رہی ہو تو ان کی کم فہمی

اور تنگ نظری جور و استبداد کے خنجر عریاں کے ساتھ بدفطرتی اور سنگدلی کی جراحت پنہاں بھی شامل کر دیتی ہے اور ان کی ہوسِ خون آشامی اور انتقام جوئی سسک سسک کر مرنے والوں کا تماشہ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مصیبتِ عظمیٰ اور نائبۂ کبریٰ جس میں آج ہندوستان کا مسلمان گرفتار ہے۔

وہ مسلمان جو تقسیمِ ہند کی مخالفت کیا کرتے تھے اس چیز کو اپنے مسلک کے حق بجانب ہونے کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ انہیں یہ دلیل مل گئی۔ بعض سادہ لوح مسلمان ان کی اس گمراہ کن دلیل سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ تقسیمِ ہند (یا تشکیلِ پاکستان) فی الواقعہ ایک غلط قدم تھا۔ لیکن سوچئے کہ کیا حقیقت یہی ہے!

تقسیمِ ہند سے پہلے جن جن امور میں ہندوؤں کو دستِ غالب حاصل تھا۔ ذرا غور کیجئے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گزرا کرتی تھی۔ ملازمت، تجارت، صنعت و حرفت یا اس سے آگے بڑھئے تو بلدیہ یا ڈسٹرکٹ بورڈ۔ اور آگے بڑھئے تو ہندو فرماں رواؤں کی ریاستیں۔ ذرا سوچئے کہ ان تمام شعبوں اور دائروں میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہوا کرتا تھا اور ابھی وہاں انگریز کا راج تھا۔ یہ غلط ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد چونکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم رہ گئی ہے اس لئے ہندو دلیر ہو گیا ہے۔ تعداد کا سوال ہی نہیں۔ کیا دس کروڑ اور کیا چار یا پانچ کروڑ۔ یہ بہرحال اقلیت میں تھے اصل چیز ہندو کی ذہنیت ہے۔ انگریز کے راج میں وہ دبے پاؤں چلا کرتی تھی اب کھلے بندوں سامنے آ رہی ہے۔ اگر مسلمان دس کروڑ بھی ہوتے تو بھی ہندو کی خوئے مخاصمت و معاندت میں کوئی فرق نہ آتا۔ آج بھی دیکھئے مثلاً یو۔پی، بہار، بمبئی وغیرہ میں قریب قریب اتنے ہی مسلمان ہیں جتنے تقسیمِ ہند سے پہلے تھے۔ لیکن ان کی یہ تعداد ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو رہی۔ اس لئے یہ کہنا سرتاسر بدذوقی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کی ذمہ دار تقسیمِ ہند ہے۔

اب دوسری طرف آئیے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو دس کروڑ مسلمانوں پر وہی کچھ ہوتا جو آج وہاں چار کروڑ مسلمانوں پر ہو رہا ہے۔ اس تقسیم سے کم از کم پانچ چھ کروڑ مسلمان تو ان کی دراز دستیوں اور تعاون انگیزیوں سے بچ گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ان کی دراز دستیوں سے بچ گئے بلکہ رزق اور قوت کے ان تمام سرچشموں کے مالک بن گئے جو اس کے پہلے ہندوؤں کی واحد اجارہ داری میں تھے۔ پاکستانی علاقوں کی تمام تجارت، صنعت و حرفت، کاروبار، ذرائع پیداوار اور اسباب مواصلات سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ کیا مشترکہ ہند میں کوئی مسلمان اسکا خواب بھی دیکھ سکتا تھا، اُس وقت مسلمان کے حصے میں حمالی تھی یا بقالی۔ وہاں کوئی میدان ایسا نہ تھا جس میں مسلمان ہندو کا مقابلہ کر سکتا۔ اب یہاں کوئی میدان ایسا نہیں جس میں اس کے راستہ میں ہندو حائل ہو۔ کیا یہ خدا کا کم انعام ہے واورثکم ارضہم ودیارہم واموالہم۔ وکان اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیرا (۳۳/۲۷) کہ اس نے تمہیں ان کی زمینوں اور شہروں کا اور مال و متاع کا مالک بنا دیا اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

جو لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ تقسیم ہند سے تمام مصیبتیں آ گئیں، یاد رکھو وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام تم سے چھن جائے اور تم پھر اسی تنگ نظر گوسالہ پرست ہندوؤں کے غلام بن جاؤ۔ وانہ لکم عدو مبین۔۔۔ ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کے مصائب و نوائب کا یہ حل نہیں کہ چھ کروڑ آزاد مسلمان بھی ان کے ساتھ جا ملیں اور انہی مصیبتوں میں مبتلا ہو جائیں۔ اگر آپ کا ایک بھائی جیل خانہ میں ہے تو کیا اس کی مشکلات کا مداوا اس سے ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کے ساتھ جیل خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں۔ حل اس کا کچھ اور ہوتا ہے

ذرا سوچئے کہ ہندو آج اس قدر ادھا کیوں ہو رہا ہے۔ جو کچھ اس نے مشرقی پنجاب، دہلی اور گوالیار وغیرہ کے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ جو روش اس نے جوناگڑھ، کشمیر اور آج حیدرآباد کے معاملہ میں اختیار کر رکھی ہے اور جن مشئومہ عزائم کی بعض جھلکیاں ان کے اکابرین کے جوش غیظ و غضب میں ان کی کف دہانی کے ساتھ دنیا کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا اصل سبب کیا ہے؟ آپ غور سے دیکھیں گے تو ان تمام بے انصافیوں اور دست درازیوں کی علت یہ نظر آئے گی کہ ہندوؤں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہو چکا ہے ... بس یہ ایک زعم باطل ہے جس میں ہندوؤں کے اس تمام اچھے پن کا راز پوشیدہ ہے۔ کم ظرف انسان کو جب یہ یقین ہو کہ اس کا فریق مقابل کمزور ہے تو اس کی دناءت و سفاہت انتہائی سفاکی اور قصابی میں بدل جایا کرتی ہے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جس کا جس جگہ چاہے مطالعہ کر لیجئے۔ یہی اصول آج ہندو کی بیجا ظالمانہ حرکتوں کی تہ میں کار فرما ہے۔ مغربی پنجاب میں ہندوؤں کے ہاں ایک مثل تھی کہ "مسلے تؤں ڈر نہ جائیے ڈر جائے تو ڈر نہ جائیے۔ نہیں تو آپ ڈر جائیے" مسلمان کو گیدڑ بھبکی دیجئے۔ اگر وہ اس کے رعب میں آ جائے تو خوب ورنہ خود دب جائیے۔ آج ہندوستان کا ہندو اپنی قوت کے نشہ کے زعم باطل میں اسی قسم کی بھبکیاں دے رہا ہے۔ اگر مسلمان نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ واقعی کمزور ہو چکا ہے تو ہندوؤں کی بھبکیاں فی الواقع کارگر ہو جائیں گی۔ اور اگر اس کا اس پر ایمان ہے کہ

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

تو یقین مانئے ہندو اس جیش عیسائی کی ایک دھاڑ کو بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مصاف زندگی میں سپاہ اور اسلحہ بڑی چیز ہے۔ لیکن یاد رکھئے! قوموں کی قوت کا راز ان کی سپاہ اور اسلحہ کی فراوانی میں نہیں ہوتا۔ یہ راز ان کے عزم و ثبات اور ایمان و یقین میں پنہاں ہوتا ہے۔ یقین کی قوت دنیا کی ہر قوت پر غالب ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کی بنا پر تاریخ کی آنکھوں نے یہ تماشے بھی دیکھے ہیں کہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ۔۔۔ باذن اللہ۔ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ کے قانون کے ماتحت غالب آ گئیں۔ وہ قانون خداوندی کیا ہے؟ واللہ مع الصابرین (۲۴۹) یہی کہ اللہ کی نصرت عزم و ثبات کا ساتھ دیتی ہے۔ یقین کی قوتیں مادی قوتوں کی کمی کو بھی پورا کر دیتی ہیں۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگر اس پر شہادت کی ضرورت ہو تو پوچھئے بدر و حنین کے ذرات سے جنہوں نے مومنین کو بے تیغ لڑتے اور فاتح و منصور لوٹتے دیکھا ہے۔ یقین کی قوت فریقِ مقابل کے سپاہ و اسلحہ کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتی ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

الذین قال لہم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانًا
وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۰ (۳/۱۷۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے کہ تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمن نے بہت بڑا لشکر اکٹھا کر لیا ہے سو تم اس سے ڈرو اور مقابلے کے لئے نہ نکلو (لیکن یہ بات سن کر بجائے اس کے کہ وہ ڈر جاتے) ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔ اور وہ (بے خوف و خطر) پکار اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے

اور اس کا نتیجہ۔

فانقلبوا بنعمۃ من اللہ وفضل لم یمسسھم سوء واتبعوا رضوان اللہ

یہ لوگ (مقابلے کے لئے نکلے اور) اللہ کی نعمت اور فضل سے شاد کام واپس لوٹے کوئی گزند انہیں چھو نہ سکا اور وہ اللہ کی خوشنودیوں کی راہ میں گامزن ہوئے

مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کر سکتا۔ وہ خواہ مخواہ جنگ کی آگ کو مشتعل نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں امن و سلامتی چاہتا ہے لیکن وہ کسی اور کو بھی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ امن کو خراب کرے اور خدا کی مخلوق کو ستائے۔ ہندوؤں نے گزشتہ دس ماہ کے عرصہ میں دنیا پر روشن کر دیا ہے کہ وہ کس قدر امن و سلامتی کا دشمن اور ظلم و فساد کا رسیا ہے اور اس کی علت جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ صرف یہ ہے کہ وہ سمجھے بیٹھا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہے۔ لہٰذا ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعم باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان اسکا عزم کرے کہ جو آنکھ ان کی طرف بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائے گی خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہئے جو ابدالی کی تلوار نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھئے اگر ہندو کو ایک شکست مل گئی تو پھر وہ خود بھی امن سے رہے گا اور دنیا کا امن بھی بحال ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ اس کے لئے فوج اور اسلحہ پر ہی تکیہ کئے نہ بیٹھے رہئے۔ جب تک پوری کی پوری قوم عزم و ثبات سے مقابلہ نہ کرے فوج اور اسلحہ کچھ نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی قوت کا راز مسلمانوں کے عزم و ثبات میں ہے۔ جو تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم کمزور ہو وہ ملت کا بدترین دشمن ہے یا نتھا

ذالکم الشیطان یخوف اولیاءہٗ فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین ۰ (۳/۱۷۴) "یہ شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے نہ ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔" تمہیں سال گزشتہ کی قیامتِ صغریٰ سے اس حقیقت کا خود تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ مرتا ہے جو موت سے بھاگتا ہے۔ جو سامنے کھڑا ہو جائے موت اس سے خوف کھاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے اکابرین ہماری توقعات پر پورے نہیں اترے جو ہم نے اُن سے وابستہ کی تھیں یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہماری حکومت کی مشینری میں بہت سے نقائص ہیں۔ لیکن یہ چیزیں قطعاً اس کا جواز نہیں ہو سکتیں کہ آپ پاکستان کے استحکام کی طرف سے بے نیاز ہو جائیں۔ پاکستان تمام ملتِ اسلامیہ کی مشترکہ امانت ہے۔ ہمارے اکابر و اعیان اس امانت کے واحد مالک نہیں کہ اس کے ضائع ہونے میں صرف انہیں کا نقصان ہوگا۔ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ تو وہ آگ ہوگی جس کے شعلوں سے نہ خواص ہی بچ سکیں گے نہ عوام۔ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ج واعلموا ان اللہ شدید العقاب (۸/۲۵) "اس عظیم فتنے سے اپنا بچاؤ کرو جو صرف ان ہی تک محدود نہیں رہے گا جو تم میں سے زیادتی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات بڑا سخت گیر ہے" لہٰذا اپنے کارکنانِ حکومت کی ناکاریوں کی طرف نہ جاؤ۔ انکی بدنظمیوں کی وجہ سے پیدا شدہ پریشان حالیوں کی طرف نہ جاؤ۔ اپنے سامنے پاکستان کا استحکام رکھو کہ پاکستان کی بقا، خود تمہاری اپنی بقا ہے۔

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

موجودہ فنونِ جنگ میں دشمن کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فریقِ مقابل میں خوف و ہراس پھیلا دیتا ہو تا کہ ان میں انتشار و اختلال پیدا ہو جائے۔ امن کے زمانے میں اس قسم کی دہشت انگیزی اور دہشت افشانی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ قوم مخالف کے عزم و ثبات کا جائزہ لیا جائے (گزشتہ ایام "۱۵ر جون" کا ہوا اسی قسم کا مقیاس (barometer) تھا جو مسلمانانِ پنجاب کی ہمت آزمائی اور حوصلہ پیمائی کے لئے ہندوؤں کی طرف سے فضا میں پھینکا گیا تھا) اس تخویف و ترہیب کا جواب جمعیتِ خاطر اور سکونِ دماغ ہے۔ اگر ہم نے اس قسم کی دہشت انگیز خبروں کو سن کر بھاگنا شروع کر دیا تو یاد رکھئے یہ خواہ مخواہ دشمن کو حملہ کی دعوت دینا ہے۔ جب کبھی اس قسم کی دہشت انگیز افواہیں پھیلیں ان کے پیچھے یونہی نہیں لگ جانا چاہئے بلکہ ان کی تحقیق کر لینی چاہئے۔ ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (۴۹/۶) "جب کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو ہمیشہ اس خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں تم قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔" خبروں کی تحقیق بھی انفرادی طور پر نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ایسے امور کے لئے حکومت کی طرف مراجعت کرنی چاہئے

سورۃ نساء میں ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۝ (۴/۸۳)

جب کوئی امن یا خوف کی بات ان تک پہنچتی ہے تو وہ اسے خوب پھیلاتے ہیں۔ وہ اگر ایسی خبر کو رسولؐ کی طرف یا ان لوگوں کی طرف جو صاحبِ اختیار ہیں لوٹاتے تو جو ان میں بات کی تہ تک پہنچتے ہیں وہ اس حقیقت کو پرکھ لیتے۔

لہٰذا جب کبھی کوئی ایسی خبر پھیلے تو اسے اربابِ حکومت کی طرف منتقل کر دینا چاہئے تاکہ وہ اس کی تحقیق کر لیں۔ اگر یہ خبر صحیح نکلے تو پھر تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھکر اس مقصدِ وحید کے لئے آہنی دیوار کی طرح جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور کوئی حرکت ایسی نہ کرو جس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (۸/۴۶) ایسے میں ایک دوسرے سے جھگڑا مت کرو۔ ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ واصبروا (۸/۴۶) ثابت قدم رہو کہ ان اللہ مع الصابرین اللہ کی نصرت ثبات و استقلال سے مشروط ہوتی ہے اور جب دشمن کا مقابلہ ہو تو فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون ۝ (۸/۴۵) قدم جما کر سامنے آجاؤ اور ہر وقت اللہ کی نصرت کو سامنے رکھو اور اس کی یاد دل میں یہی کامیابی کا راز ہے۔ ولا تولوھم الادبار (۸/۱۵) دشمن کو پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ کھڑے ہو۔ یاد رکھو اگر تم کسی ایسے وقت پھر اسی طرح بھاگ اٹھے جس طرح پچھلے سال مشرقی پنجاب وغیرہ میں تم نے کیا تھا۔ تو جس بے عزتی اور بے حرمتی سے وہاں سے نکالے گئے تھے (حاکم بدہن) اس سے بدتر حالت میں یہاں سے نکالے جاؤ گے اور سچ پوچھئے تو اب تو کہیں نکل بھاگنے کا راستہ ہی نہیں۔ اس لئے اب عزم و ثبات سے کھڑے ہونا۔ اللہ کی موہبت نے تمہیں بڑی فراواں قوتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ مسلمان جیسا سیاہی دنیا کی کوئی اور قوم پیدا نہیں کر سکی۔ پاکستان کے ذرائع پیدائش اتنے وسیع ہیں کہ ساری دنیا تمہاری محتاج ہوگی اور تم دنیا میں کسی کے محتاج نہیں ہوگے۔ آج بھی دنیا کے بازارِ بیع و شری میں تمہاری ساکھ بہت بڑی ہے۔ تم جم کر کھڑے ہو گئے تو اس ستون کے سہارے پورے عالم اسلامی کی عمارت کھڑی ہو جائے گی۔ کیا تم نے اس بچے کی بات نہیں سنی جو کوفہ کے بازار میں جا رہا تھا۔ بارش سے بازار میں کیچڑ ہو رہی تھی اور بچہ تیزی سے چل رہا تھا۔ پیچھے پیچھے امام اعظمؒ آ رہے تھے۔ انہوں نے کہا: بیٹا! سنبھل کر چلو۔ پاؤں پھسلا تو گر پڑو گے۔ بچے نے مڑ کر دیکھا تو عرض کیا: حضور! میری فکر نہ کیجئے۔ اپنا پاؤں سنبھالئے۔ میں پھسلا تو تنہا میں ہی گروں گا۔ اگر خدانخواستہ آپ پھسل گئے تو سارا عالم اسلامی نیچے آگرے گا۔ پاکستان کے مسلمانو! عالم اسلامی میں آج تمہارا مقام، مقامِ اعظم ہے۔ تمہارے سنبھلنے سے عالم اسلامی سنبھل جائے گا اور تمہارے پھسلنے سے ساری اسلامی دنیا پھسل جائے گی۔ صرف اسلامی دنیا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ آگے۔ یہ خطۂ ارض قرآنی نظام کے

احیاء و ترویج کی تجربہ گاہ بننے کے لئے تمہیں دیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر تم نے ہمت ہار دی تو نوع انسانی خدا کی کتنی عظیم نعمتوں سے محروم رہ جائے گی اور پھر ان کی تمام ظلمت کاریوں کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اللہ نے تمہیں نوع انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا ہے۔ اجتباء و اصطفاء کا یہ مقام ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتا واذکروا نعمة اللہ علیکم۔ اللہ کے انعامات و احسانات کو سامنے رکھو اور پھر سوچو کہ تمہارا فریضہ زندگی اور نصب العین حیات کیا ہونا چاہیئے! اللہ تمہیں اس مقام پر لیجانا چاہتا ہے۔ لیکن اگر تم ان ہندوؤں کے سامنے جھک گئے جو خود پتھروں اور حیوانوں کے سامنے جھکتے ہیں تو سمجھ لو کہ دنیائے انسانیت میں یہ کتنی بڑی گراوٹ ہوگی۔ حکومت جو کچھ اس ضمن میں کر رہی ہے کرنے دو لیکن تم خود اپنے اپنے طور پر، اپنی اپنی جگہ پر منظم ہو جاؤ۔ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر محلہ محلہ اپنی تنظیم کرتے جاؤ، بس ایک مقصد کے لئے اور وہ مقصد ہے استحکام پاکستان تاکہ اس میں خدا کی حکومت قائم ہو سکے۔ بیس آدمی جمع ہو جاؤ اور اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لو یہ بیس اس سرکردہ کے پیچھے چلیں۔ اور پھر بیس سرکردہ جمع ہو کر اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لیں اور اس طرح سے یہ سلسلہ دراز ہمہ گیر ہوتا چلا جائے تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا (۳۴/۴۶) اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ بس یہ ہے حقیقی کامیابی کا راز۔

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر سارا پاکستان اسی طرح سے بتکدہ بن جائے گا جس طرح سومنات کی مسجد بتخانہ بنا دی گئی۔ ویا لیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا۔

یہ لمعات جولائی ۱۹۶۴ء میں لکھے گئے تھے۔ آپ انہیں دیکھئے اور اسکے بعد ان اقدامات کو سامنے لایئے جو ہندوؤں کی طرف سے اس سترہ برس کے عرصہ میں پاکستان کی سالمیت (بلکہ جداگانہ تشخص) کو ختم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً عمل میں آتے رہے ہیں۔ آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہندو ذہنیت ایک نودولتیے رئیس زادہ یا ایک بگڑے ہوئے بچے کی سی ہے جس کی تخریبی کاروائیوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے شتر بے مہار کی طرح بدلگام نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ اور یہ رکاوٹ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی دراز دستیوں کا مقابلہ قوت سے کیا جائے۔ پاکستان نے اسے مہلت کا عرصہ بہت لمبا دیا اور بالآخر ہمیں رن آف کچھ میں وہ کچھ کرنا پڑا جس کا مستحق ہندو بہت پہلے سے ہو چکا تھا۔ ہم حکومت پاکستان کو اس بروقت فیصلہ پر درخور صد مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اس فیصلہ کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے ہماری فوج نے جس شجاعت، جرأت، ثبات و استقامت

کا مظاہرہ کیا، ہم اس کے لئے ان کی خدمت میں بھی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ نیز ہماری شہری آبادی نے ایسے نازک وقت میں جس صبر و سکون، بلند حوصلگی اور جمعیتِ خاطر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے لئے باعثِ صد فخر و مباہات ہے۔

اپنے گھر کی حفاظت فریضۂ انسانیت ہے۔ لیکن پاکستان تو ہمارے لئے گھر سے بھی زیادہ گراں بہا متاع ہے۔ یہ ذریعہ ہے اس نظامِ خداوندی کے قیام کا جس میں نہ صرف ہماری بلکہ عالمگیر انسانیت کی صحیح فلاح و بہبود کا راز پوشیدہ ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی حفاظت ہمارا انسانی فریضہ ہی نہیں بلکہ ایمان کا تقاضہ ہے۔ بنا بریں ہم اہلِ پاکستان سے گزارش کریں گے کہ اس خطۂ زمین کی حفاظت اور سالمیت کے لئے اگر انہیں کسی دشواری، مشکل یا تکلیف یا خطرہ تک کا سامنا کرنا پڑے تو اسے خندہ پیشانی سے برداشت کریں اور اس ضمن میں کسی قسم کی گھبراہٹ تشویش یا پریشانی کو قریب تک نہ آنے دیں۔

اس سلسلے میں ہم ملک کے اربابِ حل و عقد سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ ملک کی دفاع کے لئے جس حسنِ تدبر کا ثبوت دے رہے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ بتدریج ایسے اقدامات بھی کرتے جائیں جن سے اہلِ ملک کا یہ خیال یقین میں بدلتا جائے کہ ہمارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو حصولِ پاکستان کے لئے ہمارا منتہائے مقصود تھا۔ یعنی ملک میں قرآنی نظام کی عملی تشکیل۔ پھر دیکھئے کہ یہی پیکرانِ آب و گل مخالفت کے ہر خس و خاشاک پر کس طرح برقِ خاطف بن کر گرتے ہیں۔ اس لئے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اور

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

لائل پور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن

ہر جمعہ کی شب کو نمازِ عشاء کے بعد، نمائندہ بزم، خان محمد اکرم خان کی قیام گاہ ۔ ۴۰۸ ۔ اے (پنجاب ڈیریز) سیپلز کالونی میں ہوتا ہے!

انشاء اللہ

(سرسیدّ احمد خاںؒ)

[سرسیدؒ نے ہمارے مروجہ اسلام کے غلط معتقدات اور رسومات کی اصلاح کے لئے کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ہم ان کا ایک مختصر سا مقالہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوسکے گا کہ وہ اس محاذ پر کن کن گوشوں سے اور کس کس انداز سے حملہ کرتے تھے۔

ہماری کتبِ فقہ میں ایک باب "کتاب الحیل" کا ہوتا ہے۔ اصل کتاب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ شریعت کی رو سے کون کون سی باتیں گناہ ہیں۔ اور "کتاب الحیل" میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ کونسی ترکیبیں ہیں کہ انسان وہ خلافِ شریعت کام بھی کرے اور گناہ سے بھی بچ جائے۔ مثلاً کتاب میں لکھا ہوگا کہ جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے۔ اور کتاب الحیل میں بتایا جائیگا کہ انسان کن الفاظ میں جھوٹی قسم کھائے کہ اس کے مواخذہ سے بچ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حیلوں کی حیثیت فریبِ نفس سے کچھ زیادہ نہیں۔ لیکن جو قوم ایسی فریب انگیز باتوں کو اپنی کتبِ شریعت میں درج کرکے ان پر عمل کرنے کی حوصلہ افزائی کرے، اس قوم کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ میں دیکھئے کہ سرسیدؒ اس قسم کی "شرعی حیلہ کاریوں" کی نقاب کشائی کس انداز سے کرتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب کوئی دیدہ ور، شریعت کے نام پر اس قسم کی فریب کاریوں پر نگاہ ڈالے گا تو اس کے قلبِ حساس پر کس قدر شدید چوٹ لگے گی۔ دردکی یہی شدت تھی جس نے سرسیدؒ کے ہاں طنز کا انداز اختیار کیا تھا۔ انداز تو طنزیہ ہے لیکن جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب کچھ ہماری کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

بات کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک فقیہہ، کسی عام مسلمان سے پوچھتا ہے کہ کیا تم مسلمان ہو۔ وہ اس کے جواب میں عام دستور کے مطابق کہتا ہے کہ "انشاء اللہ میں مومن ہوں"۔ اس پر وہ فقیہہ بگڑ جاتے ہیں۔ اور جھٹ سے کفر کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں۔ اس مکالمہ کی ابتدا اس پس منظر میں ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام]

کافر ۔ کافر

کیوں حضرت کافر کیوں ؟

تم نے کیا کہا ؟

میں نے کہا " انا مومن انشاء اللہ "

کافر ۔ کافر ! یوں کہو " انا مومن حقا " اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے ، ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے ۔

پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں ۔

قسم سے بچنے ، وعدہ پورا نہ کرنے ، بے گناہ دھوکا دینے ، جھوٹ بولنے اور جھوٹا نہ ہونے میں ۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے ۔ کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے ؟

ہاں جو پرہیزگار ، مولوی ، عالم ، شرع پر چلنے والے ہیں ، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں ، وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں ۔

حضرت میں تو نہیں سمجھا ۔

فقہ پڑھی ہو ، اصول فقہ کو جانتا ہو ، عالموں کی صحبت اٹھائی ہو تو جانو ، جاہل کندہ ناتراش نہ پڑھے نہ لکھے جانو تو کیا جانو ؟

حضرت آپ ہی سمجھا دیجئے ۔

ارے میاں ! ان کے معنے اگر شاء کے معنی چاہا ، اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی ، مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے جس کے معنی نے کے ہوتے ہیں ۔ اب سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوئے " اگر چاہا اللہ نے " اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو ، اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو اور بسبب نہ پورے ہونے شرط کے ادا نہ کیا جائے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا ۔ " اذا فات الشرط فات المشروط " ایک مسئلہ ہوا ، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعال عباد کا خدا ہے پس جب ان دونوں مسئلوں کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ باقی نہیں رہتا ۔

حضرت ! میں مسئلے کو تو بخوبی سمجھ گیا ، مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیونکر نہیں رہتا ؟ کیا وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے الٹ جاتا ہے ؟

جاہل ! اور کیا ؟ ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے ۔ ہمارے دوست کو اس کی ضرورت ہے جب اس نے ہم سے مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں ، اس نے کہا قسم تو کھاؤ ۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہیں ۔ یا ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے ۔ ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں ، اس نے کہا قسم تو کھاؤ ۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں ۔ کیوں ۔ سچ بات ہوئی کہ نہیں ؟ بات ہی بات میں گناہ الٹ گیا کہ نہیں ؟ یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں ، روپے ، پیسے ، سود بٹے کے معاملہ میں بھی لفظوں ہی کے الٹ پھیر سے گناہ الٹ جاتا ہے ۔ تولہ بھر سونا سولہ روپیہ کی قیمت کا ہم سے قرض لو ، سود سے بچنے کو کہہ لو کہ بیس تولہ چاندی لیں گے ۔ سولہ تولہ چاندی میں وہی تولہ بھر سونا آیا اور چار تولہ چاندی سود میں بچ رہی اور سود نہ ہوا ۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا تانبے کا

میل ہو، قرض دو، اور اسی وزن کے برابر کھرا سونا لے لو، مال تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا، مکان گروی رکھو، راہن سے کہلوا لو کہ سکونت میں نے بھی کی کرایہ کا فائدہ ہوا اور سود نہ ہوا، گاؤں گروی لو مثلاً ہزار روپے کو جس میں دو سو روپیہ سالانہ کا فائدہ ہو، راہن سے اسی روپیہ سال دینے کے اقرار پر پٹہ لکھوا لو اور گاؤں پر قبضہ کر لو، کل منافع تحصیل کرو، ایک سو بیس روپیہ سال سود کے، بیٹے کے نام سے بچے کہ نہیں؟ اور سود نہ ہوا۔

حضرت! کیا یہ ہوتا ہے؟

خدا کی قسم سب کرتے ہیں، جتنے مقدس، خدا پرست، وہابی، نیم وہابی، مقلد حنفی، زمیندار متعلقہ وہ ہیں سب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے دیدیئے ہیں۔

اب سمجھے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا کہ نہیں؟ جی ابھی ہمارے پاس زکوٰۃ کا روپیہ آئے اور ہم مستطیع ہوں، ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہ آویں کہ ہم نے اپنا کل مال تم کو ہبہ کیا، اب مفلس ہو گئے کہ نہیں؟ باہر آویں اور زکوٰۃ کا روپیہ لے لیں، باتیں ہی تو ہیں، ان باریکیوں کے سمجھنے کے لئے علم درکار ہے۔

بھلا حضرت یہ تو ہوا، انشاء اللہ والی بات رہ گئی اس کو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔

ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا دل خوش کرنے کو تم سے کہہ دیا کہ ہم کل تمہارے ہاں آویں گے انشاء اللہ، ہمارا ارادہ آنے وانے کا کچھ نہ تھا یوں ہی کہہ دیا تھا، سبب نہ گئے تو معلوم ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا، اسی وعدے کو مشروط کیا تھا، اذا فات الشرط فات المشروط۔ بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا۔ کبھی تم عدالت میں گواہی دینے بھی گئے ہو؟

ملاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو سچ تھا وہ کہہ دیا تھا، مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا، میں کیا کرتا وہاں ایک کالی مخمل کی گول چینٹ دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے قسم دی کہ سچ کہنا، میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا سچ کہہ دیا۔

ہاں فقہ نہ جاننے سے عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی نتیجہ ہوتا ہے، ارے جب اس مولوی جج نے قسم دی تھی کہ سچ بولنا تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا انشاء اللہ، اگر وہ جج نام کا مولوی تھا، اور فقہ نہ جانتا تھا تو پکاری کر انشاء اللہ کہہ دیا ہوتا اور اگر وہ مولوی تھا اور ٹھیٹھ سے ٹھیٹھ بدذاتی آن پڑی تھی تو پکا کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ دیا ہوتا انشاء اللہ، مگر یہ خیال رکھا ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے ورنہ انشاء اللہ کا جوڑ ٹوٹ جاتا، پھر جو چاہتے وہ کہہ دیتے، ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا۔

حضرت! باتیں تو آپ نے خوب بتائیں مگر میں حیرت میں ہو گیا، اب تو رخصت ہوتا ہوں، اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا، میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا ہے۔

"تم جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتلائے گا، کہو میں ابھی ہدایہ، شرح وقایہ، در مختار، بحرالرائق نہر الفائق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے

ہر ایک جسٹری کی روایت نکال دوں اور تم نے وہ فتاویٰ بھی دیکھا ہے؟ جو پرانے خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے، میں اس وقت اس کا نام بھول گیا ہوں یاد آجائے گا تو بتا دوں گا۔ اس میں ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں، ایک میں جائز حلال اور دوسری میں ناجائز حرام لکھ رکھا ہے۔ پھر جونسی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لے لیا، بہت

ہوا روپیہ دو روپیہ، فتویٰ کے نام سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے۔ کیوں؟ بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا کہ نہیں؟ مگر اس زمانے میں جو کمبخت مقلدین فلاسفہ علاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہب اسلام کی جسٹر کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیسا مشکل پڑی ہے!!!

کیا آپ کو اتنی فرصت ہے

کہ آپ گذشتہ اڑھائی ہزار سال کے مختلف مفکرین، مورخین، سیاسی مدبرین۔ مذہبی مصنفین اور نامور سائنسدانوں کے خیالات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان سب کا رجحان کس طرف ہے۔

آپ کو فرصت نہیں ہو سکتی

آپ کیلئے یہ کام اس معرکہ آرا کتاب نے کر دیا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ملسکتی۔ اس کتاب نے اتنا ہی نہیں کیا کہ دنیا بھر کے ائمہ فکر و نظر کے خیالات یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی عقل، کس طرح خدا کی وحی کی محتاج ہے۔ اس عجیب و غریب کتاب کا نام ہے۔

انسان نے کیا سوچا

ضخیم کتاب۔ سفید کاغذ۔ ٹائپ کی طباعت حسین اور پائیدار جلد۔ قیمت:- ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

رابطہ باہمی

(بزم ہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

پرویز صاحب کا دورۂ ملتان

۳۰ر اپریل اور یکم مئی ۱۹۶۵ء کو محترم پرویز صاحب نے بزم طلوعِ اسلام ملتان اور بار ایسوسی ایشن ملتان کی دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا اور ملتان کا دورہ فرمایا۔

۳۰ر اپریل صبح پی آئی اے کے طیارہ سے محترم پرویز صاحب، شیخ سراج الحق صاحب کے ہمراہ ملتان تشریف لائے۔ بزمہائے طلوعِ اسلام ملتان، ۵ گسی، بوریوالہ، جلہ جیم، لیہ اور سمندری کے نمائندہ احباب سلام و رحمت کے پھول نچھاور کرنے استقبال کے لئے ہوائی اڈا پر موجود تھے۔ وہاں سے یہ قافلہ محترم موصوف کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ میزبانی پرویز صاحب کے ہمدم دیرینہ شیخ عبدالباری صاحب نے کی۔ اسی شام بزم طلوعِ اسلام ملتان کی طرف سے محترم شیخ نذیر احمد صاحب کی قیام گاہ پر استقبالیہ کا اہتمام تھا جس میں بزم کے اراکین کے علاوہ ملتان کے معزز شہری بھی شریک تھے۔ ہنگام شب محترم پرویز صاحب نے ساڑھے آٹھ بجے بزم طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام ہونے والے کھلے اجلاس سے زیرِ صدارت جناب حاجی محمد سرفراز خاں صاحب سشن جج ملتان بموضوع "اسلام کا معاشی نظام" خطاب فرمایا۔ سامعین میں عوام کے علاوہ ایک کثیر تعداد بنک کاروں، صنعتکاروں، پروفیسروں اور وکلا کی تھی۔ اہلِ علم طبقہ تقریر سے بہت متاثر تھا۔

یکم مئی کو صبح آٹھ بجے علاقائی بزموں کے احباب محترم موصوف کو ان کی قیام گاہ پر ملے۔ یہ محفل تقریب دو گھنٹے جاری رہی۔ اس دن دوپہر ساڑھے گیارہ بجے محترم پرویز صاحب نے بار ایسوسی ایشن ملتان سے "اسلام میں قانون سازی کا اصول" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ بڑی عمدہ مجلس تھی۔ بات ... قانون کی۔ مخاطب ... قانون دان طبقہ۔ قانون ہی کی زبان میں پیش کرنے والے جناب پرویز۔ ہر گوشہ نکھرتا چلا گیا۔ تقریر کے بعد وضاحت طلب سوالوں کے جوابات نے رنگِ محفل میں مزید حسن اور نکھار پیدا کر دیا۔

شام ہونے کو تھی کہ محترم پرویز صاحب کو نمائندگانِ بزم ہوائی اڈہ پر الوداع کہہ رہے تھے

باایں آرزو کہ ع

بسلامت روی و باز آئی

یہ دو روزہ دورۂ ملتان اور اس کی کامیابی محترم شیخ نذیر احمد صاحب، ان کے رفقا اور اراکین بزم خصوصاً شاہ سنفر کی سعی مشکور ہے۔

—— بزم کے ہفتہ وار اجتماعات ہو رہے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ کا انتظام کر لیا گیا ہے آئندہ سے ہر جمعہ بعد نماز مغرب ورکشاپ ایم شاہ محمد اینڈ سنفر موٹر سپیئر پارٹس مینو فیکچررز بیرون پاک ملتان ٹیپ پر پرویز صاحب کا درس قرآن سنایا جائیگا۔ انشاء اللہ۔ پمفلٹ "ہم عید الفطر کیوں مناتے ہیں" اور "آلیا کیوں ہے" تقسیم کئے گئے۔

مفکر قرآن راولپنڈی میں

محترم پرویز صاحب کے دورۂ راولپنڈی کا پروگرام، موسم کی غیر یقینی حالت کے پیش نظر ۲۵-۲۲ اپریل کی بجائے ۱۶-۱۴ مئی پر بدل دیا گیا تھا، جوں جوں یہ دن قریب آ رہے تھے، شوق انتظار میں فکر قرآنی کے شیدائیوں کے دل دھڑک رہے تھے کہ کہیں پھر انتظار کی گھڑیاں طول نہ پکڑ جائیں۔ ۱۴ مئی صبح کو حسب پروگرام محترم پرویز صاحب راولپنڈی تشریف لائے۔ اور دھڑکتے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا۔

آپ کا پہلا خطاب ۱۵ مئی کی شام ریلوے انسٹی ٹیوٹ ہال میں شیخ سراج الحق صاحب سیکرٹری سترا تمک سوسائٹی لاہور کی صدارت میں ہوا۔ محترم عزیز احمد قریشی نمائندہ بزم راولپنڈی نے تلاوت قرآن کے بعد مختصر الفاظ میں محترم پرویز صاحب اور ان کی فکر کا تعارف کرایا۔ جس کے بعد محترم موصوف مائک پر تشریف لئے۔ موضوع تھا "ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا" - چالیس برس کی گذشتہ تاریخ کے پس منظر میں علامہ اقبالؒ کے خیالات اور قائد اعظمؒ کے ارشادات کے حوالہ جات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی اہمیت اور اس کے حصول کی غرض و غایت حسین و دلکش انداز سے پیش کی گئی۔ اس خطۂ زمین کی عظمت اور اس کی حفاظت کو دینی فریضہ کے طور پر ذہن نشین کرایا۔ تقریر کے خاتمہ پر سامعین کے تحریری سوالات کے جوابات دیئے گئے۔ سوالات اتنے سلجھے ہوئے تھے کہ سامعین کی بلندئ فکر کی داد دینے کو دل چاہتا تھا اور پتہ چلتا تھا کہ کتنے غور اور توجہ سے محترم پرویز صاحب کو سنا گیا۔

۱۶ مئی بروز اتوار صبح آٹھ بجے پنڈی کی حسین و پر رونق بستی میں جسے "اسلام آباد" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پرویز صاحب کی دوسری تقریر "ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں" کے موضوع پر تھی۔ پاکستان کی یہ نئی بستی اپنے محل وقوع کی دلکشی اور خوبصورتی، عمارات کی موزونیت، فضا کی رعنائی کے ساتھ ساتھ اپنے مکینوں کے حسن ذوق اور بلندئ طبع کی گواہی دے رہی تھی۔ گورنمنٹ ہائی سکول کے طرز نو پر ساختہ ہال میں جہاں لاؤڈ سپیکر کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

جلسہ کا انتظام تھا۔ جلسہ کا آغاز محترم عزیز احمد قریشی صاحب کی صدارت میں، ان ہی کی "تلاوت قرآن پاک" سے ہوا۔ تلاوت کے بعد ایک خورد سال طاہرہ بیٹی "شمیم" نے اقبال کی نظم "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" خوش الحانی سے پڑھی۔ اور پھر محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔ کہ "میں اپنی عمر کا ایک طویل حصہ ان ہی دفتری چار دیواریوں اور ماحول میں گذار کر گیا ہوں۔ اور آج ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ میں دوبارہ اپنے ساتھیوں میں موجود باتیں کر رہا ہوں۔"

زندگی کی "اقدار" ان کو سمجھنے کی ضرورت، یا ندانہ نگاہ ان کی اہمیت و قیمت اور پھر بوقت تقابل ان میں سے ایک کے چناؤ کی وقعت و حیثیت، تاریخی اور قرآنی مثالوں سے سامنے لائی جارہی تھیں۔ سامعین کی محویت کا یہ عالم تھا، کہ جب ۱½ گھنٹہ کے بعد تقریر ختم ہوئی۔ اور سوالات کے لئے کہا گیا۔ تو کسی ایک جگہ سے بھی آواز تو آواز، حرکت تک نہ ہوئی۔ برخاستگی کے اعلان پر جب آدھا مجمع ہال سے نکل چکا تھا۔ دو نوجوان سوال لکھ کر لائے۔ اور جواب کی خواہش کی۔ پرویز صاحب اس وقت مجمع میں گھل مل گئے تھے۔ ہر آدمی یوں بڑھ بڑھ کر ان سے مصافحہ کر رہا تھا کو یہ یہ مدت کا ایک بچھڑا ہوا دیرینہ رفیق ہو نہیں ملگیا ہو۔ جب انہیں سوالات اور نوجوانوں کی بے تابی تمنا سے آگاہ کیا گیا۔ تو وہ فوراً سٹیج پر دوبارہ پہنچ گئے۔ ان کے سٹیج پر پہنچتے ہی ہر ایک اپنی نشست پر واپس آگیا۔ اور اس طرح دوسری نشست شروع ہوئی۔ باتوں باتوں میں کمیونزم، سوشلزم اور اسلام ازم کے وہ باریک نکتے حل ہوتے رہے۔ جن تک عام نگاہیں نہیں جاتیں۔ اور جن کی وجہ سے ذہنوں میں الجھن اور دل میں شکوک موجود رہتے ہیں۔ اس نشست کے خاتمہ پر ایک بزرگ دوست سٹیج پر تشریف لائے۔ جذبات سے زبان بند اور فرط شوق سے ہونٹ لرز رہے تھے۔ محترم پرویز صاحب کا ہاتھ تھام کر بڑی مشکل سے اتنا کہا۔ "پرویز صاحب آپ کا کالج کب بن رہا ہے۔ جلدی کیجئے۔ میں پہلا کمرہ بنواؤں گا۔ بلکہ دو کمرے اور اگر ضرورت پڑی۔ تو لاکھ روپیہ تک دونگا۔" "خدا کے لئے جلدی کیجئے۔" دل کی عمیق گہرائیوں سے ابھرے ہوئے جذبات، الفاظ کا سہارا پاکر آنسوؤں کی شکل میں امنڈ آئے تھے۔ اُن کی نمود نے نہ صرف پرویز صاحب، بلکہ حاضرین تک کی آنکھوں کو پرنم بنا دیا۔

اس دورہ کا آخری اجلاس اسی دن ۱۶ مئی بروز اتوار ۵ بجے شام سی۔ بی گرلز کالج، صدر بازار کینٹ راولپنڈی، کے صحن میں ہوا۔ سامعین میں خواتین کی تعداد بھی کافی تھی۔ موضوع تھا "بنیادی حقوق انسانیت"۔ کرسی صدارت پر اس وقت بھی نمائندہ بزم راولپنڈی محترم عزیز احمد قریشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کا آغاز "فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ" کی آیات کریمہ کی تلاوت، اور ان کے مفہوم سے کیا۔ قرآنی نظام پر عمل پیرا ہونے کی برکات نعمائے خداوندی کی فراوانی کا مژدہ، اور پھر احکام خداوندی سے اعراض کو رزق کی تنگی اور مستقبل کی تاریکیوں کا موجب بتایا۔ تلاوت قرآن کے بعد بیبی وائی طاہرہ بیبی نے اقبال

کی ایک نظم پڑھی۔ اس کے بعد مفکر قرآن نے قرآن کی روشنی میں انسان کے انسان ہونے کی حیثیت سے بنیادی حقوق بتلانے شروع کیے۔ پرویز صاحب اتنے دلآویز پیرائے میں حقوق انسانیت سے یکے بعد دیگرے پردہ اٹھا رہے تھے۔ کہ سامعین پر طمانیت کی بارش ہو رہی تھی۔ اور مجمع پر سحر کا سا گماں ہوتا تھا۔ اور یہ طلسم اسوقت ٹوٹا جب تقریر ختم ہوئی۔ خاتمے پر چند سوالات سامعین کی طرف سے کئے گئے۔ جن کے جوابات پرویز صاحب نے نہایت بصیرت افروز الفاظ میں دیئے۔ اور رات کے تقریباً دس بجے یہ آخری محفل ختم ہوئی۔

شیدایان فکر قرآنی کا ابھی جی نہیں بھرا تھا۔ وہ اپنے محبوب سالار کارواں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سب پرویز صاحب کی قیامگاہ پر پہنچ گئے۔ جہاں آدھی رات تک اپنی باتیں ہوتی رہیں۔ چونکہ محترم پرویز صاحب کو صبح واپس جانا تھا۔ اس لئے مجبوراً بادل نخواستہ ان سے رخصت ہونا پڑا۔ کہ وہ دو تین گھنٹے آرام کرلیں۔ اور یوں پنڈی کی فضاؤں میں "قرآنی فکر" کی آواز کا دیرپا اثر چھوڑ کر محترم پرویز صاحب ۱۷ مئی کی صبح کو واپس لاہور تشریف لے گئے۔

لاہور

بزم پورے نظم وضبط اور عزم وہمت سے قرآنی فکر کی نشر واشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ بزم کے سرگرم ارکان شہر کے پر رونق بازاروں اور اہم مرکزوں میں پہنچکر لٹریچر کی تقسیم کرتے ہیں۔ بزم کے ہفتہ وار اجلاس بھی باقاعدگی سے جاری ہیں۔ ۲۱ اپریل کو "یوم اقبال" کی تقریب پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک شایان شان اجتماع کا انتظام کیا۔ اس موقع پر مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

نمائندہ بزم مرزا احمد خلیل نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ محترم ظفر عباس قریشی نے تلاوت قرآن پاک سے کارروائی کا آغاز کیا۔ جس کے بعد محترم صفدر سلیمی نے اپنے مختصر سے تعارفی خطاب میں اقبالؒ و پرویز کے قرآنی تعلق کی وضاحت کی اور واضح کیا کہ تحریک پاکستان اور معرکۂ دین و وطن کے سلسلے میں اقبالؒ کے بعد پرویز صاحب نے کس حسن وخوبی سے محاذ کو سنبھالا۔ اور اقبالؒ کے قرآنی مشن کو کامیابی سے آگے بڑھایا۔

محترم پرویز صاحب جب مائیک پر تشریف لائے تو نہ صرف یہ کہ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ برآمدے اور وسیع صحن میں بھی اہل ذوق کی بہت بڑی تعداد گوش برآواز تھی۔ محترم پرویز صاحب نے سب سے پہلے یہ واضح کیا کہ فکر اقبالؒ کا ماخذ قرآن کا سرچشمۂ حقیقت ہے۔ اقبالؒ نے بھی اسی سرچشمہ سے کسب نور کیا اور اس کے حقائق اپنے مخصوص اور حسین انداز میں دنیا کے سامنے پیش کئے۔ مفکر قرآن نے

ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری تینوں کو انسانیت کے لئے بدترین لعنت قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ تینوں قوتیں ہر دور میں نوع انسانی کے خلاف اپنا گٹھ جوڑ قائم رکھتی ہیں اور فرعون، ہامان اور قارون کی طرح اپنے اس گٹھ جوڑ کے ذریعے نوع انسانی کے لئے جذام کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر انہوں نے کلام اقبال کی روشنی میں تاریخ انسانی کی اس تلخ ترین حقیقت کو پوری وضاحت سے پیش کیا اور بتایا کہ اقبال کس حسن انداز سے حقائق قرآنی سے تمام نقاب اٹھا تا جاتا ہے۔ اور ان کے ایک ایک گوشے کو اس طرح ابھار ابھار کر نگاہوں کے سامنے لائے چلا جاتا ہے کہ قرآن کی عظمت کے نقوش نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

مفکر قرآن کا یہ بصیرت افروز خطاب ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ عرصہ جاری رہا۔ اور حاضرین برابر حقیقت کشائی اور حسن بیان کی ان دلآویزیوں میں کھوئے رہے۔

۱۳ مئی کی شام کو بزم نے اسی ہال میں مدرسۂ علی گڑھ کے یوم تاسیس کی اہمیت کو تازہ کرنے کے لئے ایک جلسہ عام کا اہتمام کیا ہے۔ (چونکہ اس اجتماع کے انعقاد سے پہلے رسالہ کی کاپیاں پریس میں بھیجے جانے کیلئے تیار ہو جائیں گی اس لئے اس کی کارروائی آئندہ پرچہ میں شامل ہوگی۔ البتہ پرویز صاحب کی تقریر کا ماحصل اس پرچہ میں شائع کیا جا رہا ہے)

کراچی

بزم کے ارکان پورے ولولے اور جوش سے سرگرم کار ہیں۔ سندھ اسمبلی ہال میں پرویز صاحب کے درس قرآن کا سلسلہ کامیابی سے جاری ہے۔ اس سلسلے میں یہاں کے تمام اہم اخبارات میں اس کا اعلان شائع ہوتا ہے۔ بزم اس تجویز پر بھی غور کر رہی ہے کہ شہر کے اہم مقامات پر ہفتہ واری درس قرآن سے متعلق سائن بورڈ لگا دیئے جائیں۔ محترم امام الدین صاحب نے نیو کراچی میں ایک گشتی لائبریری کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ علاوہ بریں بزم کے مرکزی دفتر اور لائبریری کے قیام کے لئے مناسب انتظامات زیر تکمیل ہیں۔

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب، محترم پرویز صاحب کی مطبوعات اور تحریک کا لٹریچر حسب ذیل پتہ سے مل سکے گا۔

محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام ۴/۱۰۰ فونس روڈ نیو ٹاؤن۔ کراچی

علاوہ بریں ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال، بندر روڈ، کراچی میں پرویز صاحب کے درس قرآن کے موقع پر بھی تحریک کا لٹریچر اور ضروری مطبوعات حسب ضرورت مہیا کی جاتی ہیں۔

(محترم فقیر بخش بگٹی۔ بستی۔ بلوچستان)

ملّی یکجہتی کیسے پیدا ہو۔؟

اگر تاریخ عالم کا بنظرِ دقیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اقوامِ عالم کی موت و حیات میں ایک اصول ہر وقت اور ہر جا بطور قدرِ مشترک موجود رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا کی مختلف اور بے شمار اقوام صرف ایسے اوقات میں وجود میں آتی رہیں اور اپنی ہستی میں منفرد ہو کر ممتاز ہوئیں جب انہوں نے کسی نہ کسی مخصوص نظریہ حیات کو اپنا کر اس پر اپنے معاشرتی سانچے کو عملاً ڈھالا۔ جب تک ان میں وہ نظریہ کسی قسم کی آمیزش کے بغیر موجود رہے اور جب تک وہ ان پر صدقِ دل سے عمل کرتی رہیں وہ حیات در آغوش رہیں اور جونہی وہ نظریہ کسی قسم کی آمیزش کا شکار ہوئے اور نتیجۃً ان کے معاشرے بھی اس آمیزش سے متاثر ہوئے تو وہ رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر اپنی موت مرتی رہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی قسم کی بحث و تمحیص اور تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس عالمگیر اصول کی توثیق قرآن نے بھی کی۔ اس نے اپنا مخصوص اور منفرد نظریۂ حیات پیش کیا اور اس پر ایک ملت کی بنا ڈالی۔

دورِ غلامی نزولِ قرآن کے وقت یوں تو دنیا میں کئی قسم کے نظریاتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا چلن تھا۔ مگر ان سب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ اپنی خارجی صورتوں اور فروعات میں مختلف ہونے کے باوصف ایک بنیادی اصول میں باہم اس طرح مربوط، منسلک اور غیر منفک تھے کہ ان میں ایک ہمہ گیر وحدت تھی جو انسان کی غلامی تھی!

جاگیرداری، زمینداری، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری غرضیکہ کسی بھی نظام کو دیکھئے اس میں بنیادی عنصر یہ تھا کہ ان میں سے ہر نظام اس اصول پر مبنی تھا کہ اس میں دو فریق یا گروہ تھے۔ ان میں سے ایک محنت کرنے والا کمانے والا گروہ تھا۔ اور دوسرا وہ جو کہیں تو زمین کی پیداوار سے گھر بیٹھے حصہ پاتا تھا۔ کہیں تختِ شاہی پر متمکن ہو کر خود کوئی کام کئے بغیر محصول اور مالیہ وغیرہ کی صورت میں اپنا حصہ لیتا تھا، کہیں ہیکلوں اور مندروں میں بیٹھ کر کسی قسم کی محنت اور کاوش کے بغیر، دان پن اور صدقات حاصل کرتا تھا اور کہیں

کسی نہ کسی حیلے بہانے سے محنت کش طبقے سے اس کی کمائی چھین لیتا اور اسے، دوسروں کے ذریعے، استعمال میں لاکر ارتکازِ دولت کرتا تھا۔ غور کرنے سے یہ حقیقت غیر مشکوک طور پر واضح ہوگی کہ یہ سب غلامی کی مختلف صورتیں تھیں کیونکہ محنت کش کی محنت کے ماحصل سے اگر کوئی دوسرا انسان، خود کام کئے بغیر، کچھ وصول کرتا ہے تو اس کا مطلب سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ کمانے والے کو غلام مانا جائے! اس لئے نزولِ قرآن کے وقت غلامی کا دور رہا!! دوسری طرف یہ صورتِ حال اس حقیقت کی غماز تھی کہ اس وقت انسان میں وحدتِ فکر کا فقدان تھا۔ اور وحدتِ فکر کے فقدان اور اس متنوع سلب و نہب کے باعث انسانی مفادات باہم متصادم ہوکر فسادِ عظیم کا موجب بنے ہوتے تھے۔

سارے فساد کا موجب مال تھا

پھر ان ساری مصیبتوں، مفادات کے تصادموں اور انسانی غلامی کی تہ میں ایک ہی راز پوشیدہ تھا۔ اور وہ تھا مال! اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان کی تقسیم، انتشار اور فساد و آغوشش اور گوناگوں غلامی کا بنیادی سبب مال ہی تھا۔

قرآنی نظریہ حیات

چنانچہ اس تہ در تہ دورِ غلامی میں قرآن آیا اور اس نے اپنا نظریہ حیات پیش کیا۔ قرآنی نظریہ حیات کے مطابق سب انسان برابر ہیں۔ ایک اصل سے ہیں اور ایک ہیں۔ کسی کو نہ تو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی دوسرے انسان پر اپنا حق چلائے اور نہ یہ کہ کسی کی کمائی میں مُفت کا ساجھی بنے۔ ہر انسان اپنے عمل کا ذمہ دار، اس کے منافع کا خود مستحق اور اس کی مضرتوں کا خود متحمل ہے۔ مال چونکہ زمین سے عبارت ہے اس لئے اس نے زمین کو خدا کی ملکیت قرار دے کر نوعِ انسان کے لئے حصولِ رزق کی اس طرح متاع مشترک قرار دی کہ ہر انسان اپنی ضروریات کے حصول کے لئے اس پر برابر کا حق رکھتا ہے۔ پھر انسان کی معاشری اور معاشی زندگی (جو بنیادی طور پر مال کے گرد گردش کرتی ہے) کے لئے ایسے ابدی اور غیر متبدل اصول دیئے جن سے وہ پُرامن ہوتی۔ اس دعوتِ تو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مخاطب اس کے ماننے

مومن و کافر

والوں اور نہ ماننے والوں میں بٹ گئے اور انسان کے اصولی طور پر دو گروہ ہوئے۔ یعنی ایک وہ جو قرآنی قانونِ زندگی پر ایمان لاتا ہے۔ اسکو صحیح درست اور مبرا از فساد مان کر اپنے معاشرے کو اس کے مطابق متشکل کرتا ہے اس کو وہ اپنی اصطلاح میں مومن کہتا ہے اور دوسرا وہ جو اس سے انکار کرتا ہے اس کو عرفِ عام میں کافر کہا جاتا ہے۔

اپنے ماننے والوں (مومنین) کو وہ ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے اور جب سارے مومنین باہم بھائی بھائی ہوئے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ بھائی بھائی ہونا کوئی مجرد اور محض خیالی شے نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس سے مراد اس حقیقتِ عظمیٰ کا علیٰ وجہ البصیرت اقرار کرنا ہے کہ تخلیقی

طور پر سب انسانوں کے اقتضاآت ایک جیسے نہیں ان کی ضروریات زندگی متشابہ اور مساوی نہیں اور انکا حصول محنت پر منحصر ہے۔ محنت کرنا اور اپنی ضروریات کو زمین کی متاع بے بہا سے حاصل کرنا سب کا ناقابل تنسیخ حق ہے

فرد کے حقوق و فرائض

اس جہت میں ہر ایک اپنی مساعی کو عادلانہ طور پر جس قدر بھی بڑھا سکتا ہے بڑھائے۔ نہ کوئی دوسرا اس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے اور نہ اس کی مساعی کے ماحصل سے کچھ حاصل کرنے کا مستحق! لیکن ـــ اور یہ لیکن بہت اہم ہے ـــ ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ چونکہ متاع ارض سب کی ضروریات کی کفیل ہے۔ اس لئے کوئی بھی مومن اپنی مساعی کو دیگر مومنین ـــ اپنے بھائیوں کی ـــ اپنی جیسی ضروریات سے بے نیاز ہو کر کام میں نہ لائے تاکہ مساعی میں تصادم نہ ہو، یگانگت میں غیریت راہ نہ پائے۔ یکسانیت میں اختلاف و افتراق نہ آئے، اخوت، عدویت کا شکار نہ ہو اور برادرانہ مساوات مسابقت سے مجروح نہ ہونے پائے۔ مال سب کا ہے، سب کے لئے ہے، اور سب کو اس کی یکساں ضرورت ہے۔ اس لئے اس کے حصول کا پیمانہ رفع ضرورت ہے! اس پیمانے سے جب اور جہاں بھی تجاوز کیا گیا اس کا نتیجہ ہمیشہ اور ہر جگہ فساد ہوتا رہا! اسلامی معاشرے میں قرآن فرد کو یہ حیثیت دیتا ہے اور اس کے حقوق کو اصولی طور پر متعین کر کے اس پر یہی قیود، اس کے اقتضآتِ حیات کے عین مطابق عائد کرتا ہے۔

قرآنی ملت

پھر چونکہ قرآن کا پیش کردہ نظریۂ حیات تمام نوعِ انسان کے لئے ہے اس پر وہ ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جو انسان کے جملہ روگوں کا علاج ہو۔ اس لئے ایسے افراد سے وہ ایک ایسا اجتماع وجود میں لاتا ہے جس میں رنگ، لسان، نسل اور وطن کوئی اہمیت نہیں رکھتے ان عناصر کا وجود ان میں کسی قسم کی مغائرت پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے افراد اپنے نظریۂ حیات کی وحدت کی زنجیر میں ایسے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ یہ خارجی اور اضافی نسبتیں بے کار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور ان ہم خیال اور متحد افراد کی یک دلی سے وہ ملت پیدا ہوتی ہے، جو ہر قسم کے اختلاف سے پاک ہوتی ہے۔ اور مومن افراد کیلئے ایک کنبے کی حیثیت رکھتی ہے۔

فرد و ملت کا تعلق

اس قسم کی ملت کی تاسیس کے بعد قرآن فرد و ملت کے تعلقات کو متعین کرتا ہے تاکہ وہ کشمکش باہمی کا شکار نہ ہوں۔ قرآن کی رُو سے بنیادی اہمیت فرد کو حاصل ہے نہ کہ ملت کو۔ ملت افراد سے بنتی ہے نہ کہ افراد ملت سے۔ جب تک فرد کی اس حیثیت کو مانا نہ جائے گا اسوقت تک کسی ایسی ملت کا قیام و بقا ناممکن ہے جسے افراد کی دلی حمایت اور بھرپور تعاون حاصل ہو۔ قرآنی ملت ایسے افراد کا مجموعہ ہوتی ہے جو اپنی اپنی اقوام سے رضا کارانہ طور پر کٹ کر اس کے رکن بنتے ہیں۔ ظاہر

ہے جب تک ملت، افراد کی اس حیثیت کو قبول نہ کرے گی اس وقت تک وہ اپنے حقیقی وجود سے محروم رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ قرآنی ملت ہم خیال و متحد افراد کے مجموعے کا نام ہے اور جب افراد کا اجتماع اس اصول پر ہو کہ وہ باہم متحد ہیں تو اس اجتماع میں مفادات کی وحدت بھی لازمی ہے۔ اس نکتہ نظر سے ملت افراد کے مفادات کی امین ہے اور امین ہونے کی جہت سے اس کے اور افراد کے مفادات میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہے کہ ملت کا اپنا کوئی مفاد ہی نہیں۔ وہ چونکہ افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے اس کا مفاد افراد کے مفادات سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے ایسی ملت میں نہ تو افراد کی مساعی باہم متصادم ہوں گی اور نہ فرد و ملت میں کسی قسم کی کشمکش کا اندیشہ ہوگا۔

قرآنی معاشرہ

ایسی ہی ملت جو اپنے وجود کے لئے افراد کی رہین منت ہوتی ہے جو سب افراد کو ایک نظر سے دیکھتی ہے جو سب کی ہے، سب کے ہے اور جہاں ہماری کوئی غرض نہیں رکھتی، ایک مثالی اور فلاحی معاشرہ قائم کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے افراد کو اس میں رہ کر اپنی انفرادی اور مجموعی حیات کی ضمانت ملتی ہے۔ یہ ملت چونکہ اپنے افراد کے مفادات کی بے غرض امین ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے افراد اپنے معاملات کا نظم و نسق بطیب خاطر اس کے سپرد کرتے ہیں، ایسے ملی امور کے لئے جن میں ہر فرد شریک و شامل ہوتا ہے اپنی محنتوں کا ماحصل فاضلہ دولت اس کی تحویل میں دیں یا اپنا سب کچھ اسکو دے کر اپنی ضروریات زندگی اس سے حاصل کریں۔ ان ہر دو صورتوں میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا۔ ملت کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ افراد کے لئے ہوتا ہے۔ افراد ملت کو قائم کرتے ہیں اور ملت افراد کی نگہداشت، ان کو دیئے ہوئے سے ان کی پرورش اور حفاظت کرتی ہے۔ فرد و ملت کے اس خوشگوار ربط و ضبط کا نتیجہ وہ فلاحی مملکت یا معاشرہ ہوتا ہے جسے قرآن کا نظریہ حیات وجود میں لاتا ہے۔

قرآنی مملکت

اس سے یہ بھی بخوبی عیاں ہے کہ قرآنی نظریہ حیات پر مبنی مملکت کو آج کل کی مہیب اور دہشت کش اور انسانیت سوز مملکتوں سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے جن میں فرد کو حکمران ٹولی اپنی مصلحتوں کی خاطر خود ساختہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑ کر اس فوج اور پولیس کی قاہرانہ طاقت سے مرعوب و بے بس کر کے لوٹتی رہتی ہے۔ جو افراد ہی کی کمائی سے تنخواہ پاتی ہے۔ قرآن کی رو سے اسلامی مملکت وہ محفوظ کھیت ہے جس میں ایمان کا شجر طیب سرسبز ہو کر مومنین کی صورت میں ثمر بار ہوتا ہے یہ مملکت اپنے افراد (مومنین) کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ افراد اس کے لئے۔ یہاں بھی بنیادی اہمیت فرد کو حاصل ہے۔ کیونکہ وہ ان افراد کی اس مجموعی قوت کے نمود کا نام ہے جو اس میں رہتے اور اس کو بناتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ، افراد کی ہیئت اجتماعیہ ہے جس کا دار و مدار افراد پر ہے اور وہی اس کے قیام اور بقا کے کفیل

ہیں۔ اس لئے فرد کے بغیر مملکت ایک ایسی مجرد اصطلاح اور سراب بن کر رہ جاتی ہے جس کا نہ کوئی مطلب ہو سکتا ہے نہ مدعا! عام فہم الفاظ میں یہ وہ اضافی اور انفعالی ہیئت ہے جس کے ہر فعل کا محور فرد ہے۔ جس کا اختیار فرد سے مستعار ہے اور جسے اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ فرد کی شیرازہ بندی کرے اسے آگے بڑھا کر عالمگیر بنائے آئندہ نسلوں کو قرآنی نظریۂ حیات کے سانچے میں ڈھالے۔ دیگر افراد انسانیہ پر قرآنی نظریہ حیات کو منکشف کرنے میں ملت کی اعانت کرے۔ اور مخالف طاقتوں سے اسے محفوظ رکھنے میں ممد ہو

قرآنی امارت پھر قرآنی مملکت میں ادارۂ امارت قائم کیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ حکومت کرنے کے لئے وجود میں نہیں آتا، بلکہ اس کا منصب حکمت ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآنی نظریۂ حیات کے مطابق کسی بھی انسان کو دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ سارا قرآن، انسانی حکومت کے غلط نظریے کے خلاف شدید احتجاج کا پیکر ہے اور وہ تو آیا ہی اس لئے ہے کہ انسان کے ذہن سے اس غلط تصور کو علی وجہ البصیرت مٹا دے۔ اس کی رُو سے ساری کائنات اور انسان پر حکم صرف خدا کا چلتا ہے جس میں کوئی بھی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا۔ اگر کسی انسان یا گروہ انسانی کو حکومت کرنے کا حق یا اختیار دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ اختلاف ہوگا۔ کیونکہ حاکم و محکوم نہ تو برابر ہو سکتے ہیں اور نہ محکوم اپنی محکومی پر ہمیشہ کے لئے شاکر و مطمئن رہ سکے گا۔ پھر مومنین تو ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر اور باہم بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ کسی ایک بھائی کا اپنے دوسرے بھائی پر حاکم ہونا بعید از عقل اور نفیِ اخوت ہے حکومت کو خدا کے لئے مخصوص کر کے قرآن نے اس فساد کے دروازے کو اس سختی سے بند کیا کہ اور تو اور خود حضورؐ تک کو بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے اور کرانے والا کہا گیا۔ جب اس نظریے کے مبلغ اور نظام کے داعی تک قرآن نے حاکم نہیں بنایا تو دیگراں چہ رسد؟ غرضیکہ قرآنی معاشرہ میں مومنین باہمی رضامندی سے ادارۂ امارت قائم کرتے ہیں نہ کہ حکومت! اور امارت مندرجہ بالا فرائض کے لئے ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں چونکہ ملت اور ادارۂ امارت، دونوں قرآنی نظریات کے یکساں اور دلی ایجاب و قبول پر متفق و متحد ہو کر استوار ہوتے ہیں اس لئے ان میں یکجہتی و ہم آہنگی ایک طے شدہ امر ہے۔ یعنی قرآنی نظریۂ حیات پر ایمان اور یک جہتی و ہم آہنگی لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان کے بعد افرادِ ملت میں اور ملت اور ادارۂ امارت میں یکجہتی خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ جب اور جہاں بھی اس یک جہتی اور ہم آہنگی میں خلل آئے وہاں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایمان بالقرآن میں نقص کا نتیجہ ہے۔

رجعتِ قہقری ایسی ملت، مملکت و معاشرہ اور امارت، حضورؐ نے اپنی زندگی مبارک کی تیئیس ۲۳ سالہ محنتِ شاقہ کے بعد قائم کی تھی اور اپنے اصحابؓ کی معیت میں اسے شاہراہ

عمل پیرا ڈالا۔ آپؐ کی تشریف بری کے بعد مملکت جب تک اس نہج پر چلتی رہی اس وقت تک قرآنی ملّت بھی قائم رہی، لیکن بعد میں سابقہ اقوام کی طرح مسلمانوں نے بھی، بدقسمتی سے قرآنی نظریۂ حیات کو چھوڑ کر اپنے زوال و موت کا سامان فراہم کیا۔ انہوں نے قرآن کے نزول کے وقت کے دورِ غلامی کو اپنے ہاں رائج کیا اور جاگیرداری زمینداری، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کو ایک ایک کر کے اپنے پر مسلط کیا۔ اب حالت یہ ہے کہ وہ ہر برائی اور جہالت کا نمائندہ ہو کر رہ گئے۔ آج ملّتِ اسلامیہ قوموں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ مسلمان اقوام ایک طرف تو باہم دست و گریبان ہیں اور دوسری طرف "ہر مسلمان قوم" لسان، نسل اور وطن کے جھگڑوں میں مبتلا ہے۔ "ہر مسلمان ملک" میں معاشی لوٹ کھسوٹ نہایت ہی بے دردی سے مچی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ہر منہ پر اسلام ہے۔ کہیں مغربی جمہوریت سے ہمکنار ہونے کی مساعی ہیں تو کہیں شخصی حکومتوں کے قیام کے لئے راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ مگر ان سب بعید از قرآن اور غیر از اسلام باتوں کو عین تقاضائے قرآن و اسلام کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ متمول طبقہ اسلام کے نام پر غرباء کو بھوکوں مرنے کی ترغیب دے کر خرید دولت سمیٹنے میں مصروف ہے، مُلّا ہر محراب و منبر پر گلا پھاڑ پھاڑ کر اس لوٹ کھسوٹ کو کہیں "قسمت" اور کہیں "رضائے الٰہی" قرار دے کر ان غیر از قرآن نظامہائے زندگی کی تائید اور حمایت کر رہا ہے۔ اور محرومین جو ہر ملک میں اکثریت میں ہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس مصنوعی اسلام سے بیزار اور اس پر مبنی نظاموں سے ہر جگہ برسرِ پیکار ہیں۔ ایسے میں ہر مقتدر اپنی بات طاقت سے منوانے پر تلا ہوا ہے، ہر غاصب ڈنڈے کی ضرب کو "امن" کا ضامن سمجھتا ہے، اور ہر حاکم جس کو ملّی امور کے سرانجام دہی میں صرف منصرم ہونا تھا، رضائے عوام کے علی الرغم فرعونِ زمانہ بنا ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اسلئے کہ ہر ایک کی کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کی جائے اور بیش از بیش قوت حاصل ہو! اس کا نتیجہ مفادات کا وہ غیر مختتم، پرشش ربا اور تباہ کن تصادم ہے جس کے جہنم میں سارے "مسلمان" جل بھن رہے ہیں!! اس سے صاف طور پر واضح ہے کہ جس طرح سابقہ اقوام اپنے اپنے نظریاتِ حیات کے چھوڑنے کے نتیجے میں ہلاک ہوئیں عین اسی طرح مسلمان بھی قرآنی نظریہ حیات سے انحراف کر کے تباہ ہوئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔

پاکستان کی مشکلات

یہ وہ مصائب ہیں جن میں جملہ مسلمان ممالک مبتلا ہیں۔ لیکن موجودہ حالات میں چونکہ "ہر مسلمان ملک" دوسرے "مسلمان ممالک" سے علیحدہ اور اس علیحدگی پر مصر ہے اس لئے باقیوں سے صرفِ نظر کر کے ہم صرف ان مسائل اور مشکلات کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہیں جن سے آج پاکستان دوچار ہے۔ لہٰذا آئیے ان کا جائزہ لیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنی نظریۂ حیات پر جو ملّت وجود میں آتی ہے، وہ ایسے ہم خیال اور ہم آہنگ افراد کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں زندگی کے کسی اصول اور کام کے بارے

میں نہ دو رائیں ہو سکتی ہیں اور نہ کوئی اختلاف پا سکتا ہے۔ اس لئے اس میں جو ایک کی رائے ہے وہ سب کی ہو سکتی ہے اور جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو وہ ہر فرد کا ایمان ہوتا ہے۔ پھر اس ملت کے افراد میں ان فروعات میں بھی بنیادی طور پر اختلاف کی کوئی گنجائش نہ ہوگی جو قرآنی اصولوں پر مبنی ہوں۔ کیونکہ کوئی اصول متفق علیہ ہو تو اس پر مبنی جملہ فروعات بھی بجائے خود متفق علیہ ہونگی۔ اس ملت کے افراد میں اگر کسی اصول پر اختلاف ہو تو یہ اس اصول پر ان کے ایمان کی نفی ہوگی اور اگر کسی جانے اور مانے ہوئے اصول کی فروعات میں اختلاف ہو تو، یہ اس اصول کی حقیقت اور قرآن سے ناقابلِ تردید بے گانگی ہوگی۔ لہٰذا قرآنی ملت کے افراد میں کسی قسم کا اختلاف ناقابلِ تصور اور ایمان کے نقیض ہے، نہ صرف یہ، بلکہ افراد میں اختلاف راہ پا جائے تو ملت کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ملت میں کوئی حزبِ اختلاف ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا اسکا حزبِ اختلاف تو اس سے باہر کفار کی شکل میں ہوتا ہے۔ جب حقیقت یہی کچھ ہے تو پھر جو لوگ پاکستان میں مغربی جمہوریت کے شیدائی ہیں وہ اور کچھ ہوں کہ نہ ہوں قرآنی نظریۂ حیات اور اس پر مبنی ملت اسلامیہ کی حقیقت سے یقیناً ناواقف ہیں اور اس قدر جہالت میں مبتلا ہیں کہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ قرآنی ملت اور مغربی جمہوریت ایک دوسری کی سراسر ضد ہیں اس میں اگر مغربی جمہوریت کو رواج دیا جائے تو ایک ملت کو تقسیم کرنا اور اس کے ان اصولوں سے انحراف ہوگا جنپر اسکے افراد باہم متفق و متحد ہوئے جنکو ایمان کا درجہ حاصل ہو اور جن کے نتیجہ میں ملت وجود میں آئی قرآنی ملت کیلئے وحدتِ فکر و خیال اور سعی و عمل لازمی ہے۔ اسکے برعکس مغربی جمہوریت میں اختلافِ رائے اور کم از کم دو متخالف و متصادم حزبوں کا ہونا شرطِ اوّل ہے۔ جب تک یہ شرط پوری نہ ہو مغربی جمہوریت وجود پذیر ہو نہیں سکتی! اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ پاکستان میں اگر قرآنی ملت کا قیام مطلوب ہے تو مغربی جمہوریت اس کے لئے فسادِ عظیم اور زہرِ قاتل ہوگی۔

پھر مغربی جمہوریت اس غلط نظریہ پر قائم ہوتی ہے کہ اس میں حکومت کا حق انسان کو حاصل ہے۔ (یہ بھی قرآنی اصولِ حاکمیت کی ضد ہے!) اور انسانوں کی نظر فریب اکثریت کو حاکم مانا جاتا ہے۔ اس میں دوسری غلطی یہ ہے کہ جس کو اکثریت کہا جاتا ہے وہ مختلف احزاب کے اراکین کے مجموعے کے مقابلہ میں بسا اوقات اقلیت بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس کو اکثریت کی حکومت کا نام دینا غلط ہے۔ اس میں تیسری ہولناک اور ناقابلِ عمل غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اس کی رُو سے انسان ایک ہی وقت میں اپنا حاکم بھی ہوتا ہے اور محکوم بھی، وہ خود قانون ساز ادارہ بھی ہوتا ہے اور خود جج یا قاضی بھی۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو انسانی خواص و داعیات کی سراسر ایک دوسری سے متناقض، لہٰذا ناقابلِ عمل ہیں۔ اس میں چوتھی غلطی یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ عوام سے ووٹ حاصل کرتے ہیں ان کو اسمبلیوں میں ہر بات، ہر معاملہ اور ہر صورتِ حال کے پیش آنے پر اپنے جملہ منتخب

کنندگان کا نمائندہ اور ان سب کی مرضی کا شارح مانا جاتا ہے اور اس طرح ان کا ہر صحیح یا غلط فیصلہ کو عوام کا فیصلہ قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر ناممکن ہے کہ عوام کا ہر ایسی بات میں وہی فیصلہ ہو جو یہ نمائندگان اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ اس میں پانچویں غلطی یہ ہے کہ اس میں ایک ایسا چکر چلتا ہے جس میں صرف متمول ترین طبقہ مختلف ناموں اور نت نئے رنگوں سے حکومت پر قابض رہتا ہے۔ تمام دعاوی مساوات کے باوجود عملی میدان میں دیگر افراد نہ تو اس طبقہ کے برابر ہو سکتے ہیں اور نہ اس پر حاکم اور چھٹی غلطی یہ کہ یہ ایک ایسا مہمل نظریہ ہے جو اپنے آپ کو ہر ملک میں بیشتر تو ایک نام سے کرتا ہے۔ مگر نوع انسان کے ایک ہونے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس وقت دنیا کی تقریباً دو تہائی آبادی میں یہ نظریہ نافذ ہے۔ مگر سوچئے کہ مثلاً برطانیہ، امریکہ، فرانس۔ جرمنی، بھارت "جو جمہوری" ممالک کہلاتے ہیں۔ جہاں ایک ہی طرح کا نظریہ حیات کارفرما ہے اور ایک ہی طرز کی حکومتیں قائم ہیں، وہ ایک کیوں نہیں ہوتے؟ اور ان میں سے ہر ایک اپنے جیسے دوسرے ممالک کی کمزوری میں اپنی طاقت، ان کی تباہی میں اپنی فلاح اور ان کی موت میں اپنی بقا کیوں سمجھتے ہیں۔ سچ اور حق تو یہ ہے کہ یہ نہ تو کوئی قابل عمل نظریہ ہے اور نہ ہی نوع انسان کے لئے کوئی مفید لائحہ عمل! یہ وہ تخریب پسند طریق کار ہے جو نوع انسان کو مختلف اور متحارب گروہوں میں بانٹنے اور ارض واحد کو مصنوعی لکیریں ڈال کر تقسیم کرنے کا موجب ہے۔ یہ قومیت کا جنم داتا اور وطنیت کا شیطان ہے۔ پھر، ایک طرف تو ہر قوم کے افراد میں ابدی اختلاف کا باعث ہے اور دوسری طرف اقوام کو ایک دوسری سے جدا رکھنے اور باہم عدو بنانے کی سبیل ہے! اور یہی کچھ آج ان ممالک میں عملاً ہو رہا ہے جہاں یہ نظریہ کارفرما ہے!۔ سوچئے کہ جس نظریئے یا نظام کی بنیاد ہی اختلاف پر ہو وہ کسی قوم یا نوع انسان میں وحدت کیسے پیدا کر سکتا ہے؟ اور جو ان فریب ہائے گوناگوں کا مجموعہ ہو وہ کس طرح قرآنی امارت کے ہم معنی، ہم پلہ یا اس کا نعم البدل ہو سکتا ہے! ظاہر ہے کہ پاکستان کی مشکلات میں یہ اشکال سرفہرست ہے اور جب تک اس سے گلوخلاصی نہیں ہوگی اس وقت تک ملی یک جہتی ناممکن ہے!

اسلامی سوشلزم

اس طرح، اسلامی سوشلزم کے قیام کا نعرہ بھی لگایا جا رہا ہے۔ یقین مانئے کہ جو لوگ یہ نعرہ لگاتے ہیں اُن سے اگر اس نئی اصطلاح کی تعریف (DEFINATION) کرنے کو کہا جائے تو آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جائیں گے۔ ایسے لوگ جو قرآن کے نظریۂ حیات اور اس پر مبنی مملکت اسلامیہ تک کو نہیں جانتے وہ کسی ایسے شعبۂ حیات کو کیا سمجھیں گے جو اس عظیم نظریئے پر قائم کرنا ہوگا۔ یہ نعرہ بھی صرف مسلمانوں کے سطحی جذبات کو ابھارنے۔ انہیں خواب غفلت میں چندے اور سلائے یا ایسے لوگوں کے اپنے خلاف اسلام کرتوتوں سے مسلمانوں کی توجہ کو ہٹانے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ وہ "اسلامی سوشلزم" کو زیادہ سے زیادہ اپنے

پیوندوں سے منسوب کر سکیں گے جو غیر اسلامی اصلاحات کی صورت میں اسلام کے تنِ بے جان میں لگائے جا رہے ہیں اور آئندہ لگائے جائیں گے۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر وہ نئی اصلاح جو اسلام کے نام پر، عوامی ذہن کی صحیح قرآنی تربیت اور دلی ایجاب کے بغیر نافذ کی جائے گی وہ پا در ہوا، زود میر اور کسی نئے فتنہ و فساد کا پیش خیمہ ہو گی۔ پھر جب اسلام کا دیا ہوا آئین یا منشورِ قرآن کی شکل میں موجود ہے تو یہ اسلامی سوشلزم، کس کام کا؟ اگر قرآنی نظامِ حیات کو نافذ کرنا مطلوب ہے تو قرآنی نظریۂ حیات کے مطابق عملی اقدام کیا جائے اور اگر اُس سے پہلو تہی مقصود ہے تو ایسی بے سود باتیں مضرت رسانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ ایسی اصلاحات چونکہ عوامی رائے کے برعکس نافذ کی جاتی ہیں اور ان میں جبر و اکراہ ہوتا ہے اس لئے یہ عندیۂ قرآنی کی ضد ہوتی ہیں۔ جو کام بالنظام جبر پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے فساد انگیز خاتمے کا خود موجب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنی منشورِ حیات کو بھی، جو انسان کے اپنے ہی اقتضاآت و داعیات کا بیان ہے۔ اکراہ سے منوانے سے منع کیا گیا ہے!۔

لسان کا مخمصہ

ہماری بدقسمتی، جہالت زدگی اور نا اہلی صرف اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ قرآن کو خارج از عمل کرنے سے ہم میں لسان کا مخمصہ بھی وجۂ اختلاف و افتراق بن گیا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے کرتے دھرتے یک جہتی کا ورد کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف علاقائی زبانوں کی ترقی کیلئے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ اگر پاکستانی قبائل کی فہرست بنائی جائے تو وہ سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں پر پھیل جائیگی اب ان سے کون پوچھے کہ جب علاقائی زبانوں کو قومی پیمانوں پر مانا جائے تو ان علاقوں کے قبائل کے دل میں یک جہتی کیسے پیدا ہو گی جنہیں قرآنی نظریہ حیات سے آج تک بیگانہ رکھا گیا؟ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا گیا کہ پاکستان میں دو قومی زبانیں قرار دی گئیں اور اس طرح کرنے سے یہ معمولی بات بھی اُن کی سمجھ میں نہ آئی کہ جس ملک میں دو جدا زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس ملک میں دو جدا قومیں بستی ہیں اور جب آئینی طور پر اس کا اقرار کیا جائے تو پھر ان دو قوموں میں سے کس طرح ایک قوم وجود میں آئے گی! یا ان میں سے کونسی قوم اپنی آئینی حیثیت کو چھوڑ کر اپنے وجود کو مٹانے پر آمادہ ہو جائے گی

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ ایسی نادانیوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں معاملہ فہمی کا اس قدر یاس انگیز فقدان ہے کہ ہمارے جمہوروں کو زبان کی حقیقت تک معلوم نہیں ہے۔ زبان کیا ہے؟ اول تو اس سے مراد صرف مافی الضمیر کا اظہار ہے۔ جہاں تک زبان کی اس حیثیت کا تعلق ہے۔ ہر بچہ جس علاقے میں پیدا ہوتا، جس گود میں دودھ پیتا اور جس گھر میں پرورش پاتا ہے۔ وہ خود بخود اس علاقے کی زبان کا ماہر ہوتا ہے۔ گھریلو اور علاقائی بول چال کے لئے یہ قدرتی عطیہ کافی ہے۔ اس پر مزید خرچ کرنا بے سود ہے۔

زبان کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ہر قوم (نہ کہ قبیلہ) کے علمی سرمائے کا خزانہ اور اس کی روایات کی امین ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے اگر ہماری علاقائی زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نہ کوئی علمی سرمایہ نظر آئے گا اور نہ قومی روایات ملیں گی۔ ہمارا سارا علم اور ساری روایات اسلام یا صحیح تر الفاظ میں، قرآن سے ماخوذ و وابستہ ہونی چاہئیں۔ آپ غور فرمایئے کہ قرنِ اوّل میں جب مختلف ممالک کے لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہے تو نہ تو حضورؐ نے اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے کسی قوم کی زبان کو قومی یا صحیح تر الفاظ میں عربی کے ساتھ ساتھ ملّی زبان بنایا۔ ملّت کی سرکاری زبان عربی ہی رہی اور عجمی مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنے اور اس کے غالب بنے رہنے پر کبھی بھی کوئی کد نہ ہوئی کیونکہ وہ اوّل اور آخر مسلمان تھے! اس کے بعد جب خلافت کو زوال آیا تو ہر ملک میں ہر قوم کی ایک ہی زبان کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ پر جب انگریز متمکن ہوئے تو انہوں نے بھی اپنی زبان کے بعد اُردو کو ہندوستانی زبان قرار دیا۔ دیگر بے شمار علاقائی زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی رہیں! یہ ہماری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ جس ملک کو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا اور اس مطالبے میں پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچ اور بنگالی کے مصنوعی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہا آج اُن ہی مسلمانوں کو زبان وغیرہ کے مخمصے میں ڈال کر اقوام میں تقسیم کیا جا رہا ہے! آپ ذرا سوچئے کہ ان ہی لوگوں نے، جن کو آج بڑے پیمانے پر زبان کی بنیاد پر مشرقی اور مغربی، دو قوموں کا درجہ دیا گیا اور چھوٹے پیمانے پر سینکڑوں قبائل میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ مطالبۂ پاکستان کے وقت نہ تو اپنی جداجدا زبانوں کا تحفظ مانگا تھا اور نہ ثقافتوں اور علاقوں کا۔ کیا اس کا واحد مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اسلام مانگا تھا؟ کیا اس سے مراد یہ نہ تھی وہ صرف اور صرف مسلمان کی حیثیت سے ادھر آتے تھے اور اسی حیثیت سے پاکستان کو ملّت اسلامیہ کا واحد مشترک اور غیر منقسم مسکن مانا تھا؟ اگر ان کا ملّتِ واحدہ ہونے کا ارادہ نہ ہوتا تو اس وقت وہ ان باتوں کا تحفظ ضرور مانگتے جن کو آج اتنی اہمیت دی جا رہی ہے۔ غور کرنے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گی کہ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہاں کے لوگوں میں کوئی بھی ایسا رہنما نہ ہوا جو اپنے عمل سے اپنے آپ کو علاقوں اور برادریوں کی نسبت سے بالاتر رکھ کر سب کو ایک ثابت کرتا، ہر قسم کے امتیازات سے منزہ ہو کر سب کو ایک نظر سے دیکھتا۔ جس کو سب اپنا مانتے۔ اپنے آپ میں سے پاتے اور جس کی موجودگی میں کسی کو کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ قائداعظم کے بعد جو لوگ بھی مسندِ اقتدار پر فائز ہوتے رہے وہ بالعموم ذاتی اور علاقائی اغراض کا شکار رہے۔ انہوں نے اسلام کی آڑ لے کر ایسی تباہیاں مچائیں جن سے لوگوں کے دلوں سے اسلام کی وقعت ختم ہو گئی۔ اور سب نے اپنے اپنے جداگانہ تشخص کو ضروری سمجھ کر قومیت کی حیثیت اختیار کی۔ ظاہر ہے ایسی قیادت و حکومت میں ایسا ہونا ضروری تھا اور جب تک ہم خالص

مسلمان کی حیثیت سے قوم کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش نہیں کریں گے ایسا ہوتا ہی رہے گا۔ اور بالآخر اس کا نتیجہ تباہ کن ہوگا۔

بنائے فساد مال ہے

اپنے دورِ غلامی میں مسلمانوں کو ایک دوسرے سے کسی بھی میدان میں مسابقت پیش نہ آتی تھی۔ اس وقت وہ ایک غیر قوم کے محکوم تھے اور اس کے محکومی کے باعث ملکی مال و زر کو وہ حاکم قوم کی ملکیت تصور کرنے پر مجبور تھے۔ اس لئے مال و زر ان میں اختلاف کا موجب نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مطالبہ پاکستان کے وقت چونکہ ان کو اسلام کے نام پر متحد کیا گیا تھا اس لئے سب سب کے سب اپنے آپ کو اسلامی بھائی اور ایک دوسرے کے برابر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی مساعی کر جب پاکستان قائم ہوا تو ان کے سامنے ایک وسیع ملک۔ معتد بہ مالی فراوانی کو ساتھ لئے، موجود تھا۔ عوام کے ذہن میں اسلامی برادری اور برابری کا تصور تھا۔ مگر بدقسمتی نے یہاں کا معاشری ڈھانچہ ایسا بنا یا گیا جو بدترین سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حامل تھا اور اوپر کے طبقے نے طرح طرح کی مکاریوں اور چیرہ دستیوں سے ملکی دولت کو لوٹنا شروع کیا۔ اس سے اوّل تو پاکستانی ملّتِ اسلامیہ غاصبین و محرومین کے دو گروہوں میں بٹ گئی اور اس کے بعد علاقائی مفادات کی بناء پر تقسیم و تحصیلِ مال و زر کی خاطر موجودہ ہوشربا و تباہ کن کشمکش پیدا ہوئی۔ بنائے مخاصمت تو صرف مال تھا، دولت تھی اور حصولِ زر کے وسائل تھے۔ مگر اس ایک حقیقت کو مختلف پردوں میں چھپایا گیا! کہیں آبادی کا سہارا لے کر دولت کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی کہیں آجر و مزدور کے نام پر جھگڑے اٹھائے گئے اور کہیں لسانی اور علاقائی بنیادوں پر بیش از بیش حاصل کرنے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ مقتدر طبقہ چونکہ خود اس لوٹ میں پیش پیش تھا، اس لئے جس کسی نے بھی منہ کھولا اسکی طرف ہڈی پھینکی۔ جس کسی نے آواز اٹھائی اس نے اس کو کچھ دے کر، یا دبا کر، خاموش کرنے کی سعی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص کے دل میں اسلامی اخوت کی جگہ وہ انفرادیت پیدا ہو گئی جسے قرآن نے عدویت آدم کہا ہے۔

ہماری عملی زندگی تو اس نہج پر چلتی رہی مگر سیاسی کھلاڑی اور مقتدر مذہبی عوام کو ہر مرحلے پر اسلام خدا اور مذہب کا واسطہ دے کر اپنی اغراض برآریوں میں مزید مہلت پانے کیلئے، عوام کو بدترین قسم کی گرسنگی برہنگی اور محتاجی پر رضامند رہنے اور سب کچھ غاصبوں کے لئے کمانے اور خود ہوا پیلنے کی سفیہانہ ترغیب دینے میں مصروف رہے۔ حالانکہ ایسا کرنا خدا سے بغاوت ہے۔ کیونکہ خدا نے مومنین کو اخوان بنا کر ضروریاتِ زندگی اور راعیاتِ حیات میں مساوی قرار دیا ہے، دین سے برگشتگی ہے، کیونکہ دین معاشی اور معاشرتی نظام کا توازن بدوش محفوظ ترین اور مستقیم راستہ بتانے آیا ہے۔ اور اسلام سے انکار ہے کیونکہ اسلام، قانونِ الٰہی

کو تسلیم کرنے اور سلامت روی کا نام ہے۔ نیز ایسا کرنا اُن کی کوردلی اور بے بصیرتی کا اعلان تھا کہ یہ لوگ مال و زر اور متاعِ ارض کی اس ہمہ گیر اور محوری حیثیت و اہمیت سے نابلد ہیں جس کے گرد انسانی زندگی کے دیگر تمام شعبے گردش کرتے ہیں کیونکہ مال کے بغیر نہ زندگی ممکن ہے نہ زندگی کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ نہ کوئی معاشرہ قائم ہوتا ہے نہ کوئی سیاسی نظام وجود میں آتا ہے۔ نہ تجارت ہوتی ہے نہ صنعت، نہ زراعت ہو سکتی ہے نہ حکومت۔ آخر اس میں اپنے جائز حق سے محروم رہ کر کوئی کیسے مطمئن ہو سکتا ہے۔ تاریخِ عالم کی ساری لڑائیاں اور خون ریزیاں اسی پر ہوتی رہیں۔ انسان ایک دوسرے کو اسی پر کاٹ کھاتا رہا۔ دین اسی سے متعلق فسادوں کو مٹانے کے لئے آیا اور انبیا اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے مبعوث ہوتے رہے۔ قرآنی استعارہ شجرہ بھی فسادِ مال تھا اور شیطان کے سارے پھسلاووں اور ابلیس کی تمام ترغیبات کی جڑ مال ہے۔ اگر مال کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو اور کوئی بھی شے اس درجہ بننے نزاع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ساری کارآمد اشیاء اسی پر مبنی اور متفرع ہیں۔ اتفاق ہے بیشتر تنازعات جن میں آج پاکستان اندرونی طور پر مبتلا ہے مال کی غلط اور بعید از قرآن تقسیم سے پیدا ہوئے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس اصل اور بنیاد کو عملاً حالہ سامنے رکھتے ہوئے ملی یکجہتی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟

چارہ کار قرآنی نظریۂ حیات، ملتِ اسلامیہ کی تشکیل، قرآنی معاشرہ و مملکت اور ادارۂ امارت کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن عوارض کی بھی نشان دہی کی گئی جو قرآنی نظریۂ حیات کی ضد بن کر ہماری تباہی کا موجب بن رہے ہیں۔ یہ دنیا گاہِ عمل ہے اور ہر عمل اپنا اپنا نتیجہ رکھتا ہے۔ انسان کو یہ اختیار تو حاصل ہے کہ جیسا چاہے ویسا عمل کرے مگر قدرت نے اس کو اس اختیار سے محروم رکھا ہے کہ ہر عمل کے نتیجے کو بھی وہ اپنے حسبِ منشا برآمد کرے۔ ہم اپنی حیاتِ ملی کا اس قدر قیمتی وقت برباد کر چکے ہیں۔ اسلام کا نام لے کر اسلام سے بغاوت کرتے رہے ہیں۔ ملی یکجہتی کے نعرے لگا لگا کر عملاً اس کی بیخ کنی کرتے رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ یہ مہلت کا عرصہ ختم ہو کر نتائج محسوس شکل میں سامنے آجائیں ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ ہم اپنے اس مقدر کے منتظر رہنا چاہتے ہیں کہ جس کے برآمد ہونے کے بعد پشیمانی بے سود، پچھتاوا بے کار، توبہ کا دروازہ بند اور رجعت الی الحق کی راہ مسدود ہو گی یا قرآنی نظریۂ حیات کے مطابق اپنی اصلاح کر کے ملی یکجہتی پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ہم قرآنی نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کو صدقِ دل سے مانتے ہیں تو ہمیں وہ کچھ کرنا چاہئے جو قرآن کا تقاضہ ہے اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ حکومت کے عام دنیاوی اور قرآنی نظریہ کو اس قدر واضح کیا جائے کہ لوگ پوری پوری یکسوئی اور یکجہتی سے اس کے استحکام کیلئے مصروفِ عمل ہوں اور اسے دوسرے کا کام نہیں بلکہ خود اپنا فریضۂ زندگی سمجھیں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اسوقت عوام اور "حکام" میں جو بُعد پایا جاتا ہے اسے ختم کیا جائے۔ اس کے بعد سکولوں، کالجوں اور

یونیورسٹیوں کے نصابوں اور پریس اور ریڈیو کے ذریعے قرآنی نظریۂ حیات کا ایسا بھرپور پرچار کرنا ہوگا کہ لوگ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو جائیں۔ مغربی جمہوریت کی تباہ کاریوں اور مکاریوں کو واضح کرنا ہوگا۔ قرآن کے معاشی نظام کو دلائل و براہین کے ذریعہ نوعِ انسانی کی نجات کا واحد ذریعہ ثابت کرنا ہوگا۔ فرد و جماعت کے حقوق و فرائض اور باہمی تعلقات کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق متعین کرنا ہوگا۔ لسان کا حقیقی مقصد بیان کرکے بتلانا ہوگا کہ جدا جدا زبانیں دنیا میں کہیں بھی نہ تو بنائی گئیں اور نہ قائم کی گئیں بلکہ یہ انسانی ضروریات کے مطابق خود بخود وجود میں آتی، ابھرتی اور پھر حالات کی تبدیلی سے مٹتی رہیں۔ زبانوں کی جدائی اس وقت کی بات ہے جب انسان ذرائع حمل و نقل کی کمی کے باعث دور افتادہ مقاموں میں چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں رہتے تھے اور باہم مل کر ایک ہونے سے معذور تھے۔ جوں جوں ان میں باہمی میل ملاپ پیدا ہوتا گیا ان کی وہ جُدا جُدا زبانیں بھی ایک دوسری سے متاثر ہو گئیں۔

اور بالآخر وہ ابتدائی زبانیں ایسے ناپید ہوئیں کہ آج اُن کا معلوم کیا جانا بھی ممکن نہیں آج وہ دور ہے کہ اوطان و اقوام ختم ہونے کو ہیں اور انسان اُمتِ واحدہ ہو کر رہنے کی جہت میں گامزن ہیں۔ ایسے میں علاقائی زبانیں تو ایک طرف رہیں قومی زبانیں بھی ایک بین الاقوامی زبان کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ قدرت کا اصول یہ ہے کہ جو شے انسان کے لئے زیادہ مفید ہوگی اس کو ترقی اور بقاء ہوگی اس کے مقابلہ میں کمتر یا غیر مفید اشیاء ختم ہوتی جائیں گی اس اصول کے تحت زبان بھی وہی باقی رہنے کے قابل ہوگی جس میں علم و معلومات کی فراوانی ہوگی اس لئے محدود و علاقائی زبانوں پر کسی قسم کے تعصب کا شکار ہونا علم و عقل اور انسانی ضروریات کے منافی ہے۔ اسی طرح قومیت، وطنیت اور دیگر وحدت سوز امیال و عوامل کی عقل، علم اور دلیل و برہان سے تردید کرنی ہوگی اور جب قومیت اور وطن کا بطلان ہوگا تو ملّت میں گروہ بندی و پارٹی بازی خود بخود مکروہ و ممنوع ہو گی۔ اس کام کو اگر قرآنی فکر و نظر اور حکمت و بصیرت سے سرشار ہو کر اور جملہ وسائل کو نہایت نیک نیتی سے کام میں لا کر کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کے عرصہ میں ہم پاکستان میں ملّتِ اسلامیہ کی بنا بڑی آسانی سے ٹھوس بنیادوں پر ڈال سکینگے اور پھر نوعِ انسان کو صلح و امن اور راحت و سلامتی کی دعوتِ سعید دینے کے قابل ہوں گے۔ ہر کام کرنے سے ہوتا ہے۔ پاکستان کے مطالبے اور قیام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صحیح قسم کی نشر و اشاعت اور مسلسل و موزوں مساعی سے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی دلی حمایت حاصل ہوئی جو تقسیم ہند پر بظاہر ناممکن معلوم ہوتی تھی، منتج ہوئی۔ اس لئے اب بھی قرآنی نظریۂ حیات پر ایمان اور اخلاصِ عمل ہی سے قرآنی ملّت وجود میں آئے گی اور یک جہتی پیدا ہوگی۔

لائحہ عمل اہل پاکستان صرف ایسی ہی سعی پیہم سے ملتِ واحدہ میں متشکل ہوں گے اور صرف ایسے ہی خلاص سے ان میں یہ ایمان تازہ ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ میں گروہ بندی یا مغربی جمہوریت کی طرح پارٹی بازی شرک اور مضرت رساں ہے۔ اس مرحلہ پر وہ اس خلجان سے بھی علیٰ وجہ البصیرت نجات پائیں گے کہ مختلف پارٹیاں اگر نہ ہوں تو آمریت سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی۔ ظاہر ہے اس طریق کار سے موجودہ طرزِ انتخاب جسکے لئے مختلف پارٹیوں کا وجود لازمی ہے کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ اس سے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوگا کہ اس خلاء کو کیسے پُر کیا جائے؟ اس سوال کا شافی جواب بھی قرآن، حضورؐ اور خلفائے راشدینؓ کے طریقِ کار میں موجود ہے۔

قرآن نے ملت میں ہر قسم کے اختلاف و افتراق اور انسانی حکومت کو ممنوع قرار دے کر امارت بالحکمت کا اصول دیا دان تمام امور کی تفصیل پہلے بیان کی گئی ہے اس کے لئے قرآن کریم، سُنّتِ نبوی اور مسلک خلفائے راشدینؓ کی روشنی میں ایسا طریقِ کار تجویز کیا جائے ہے جس میں کوئی شخص امارت کو جھپٹ کر نہ لے سکے۔ بلکہ ملّت اپنے میں سے بہترین فرد کو اس ادارہ کے لئے منتخب کرے۔

جو اصول اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ حسبِ ذیل لائحہ عمل حصولِ مقصد کے لئے مفید رہے گا مثلاً

(۱) پاکستان میں قرآنی نظریۂ حیات کے مطابق ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے گا کہ افرادِ ملت میں مال اختلاف و افتراق کا موجب نہ ہوگا۔

(۲) یہاں کوئی بھی ایسا نظامِ زندگی رائج نہ کیا جائے گا جسے انسانی حکومت کہا جا سکے۔

۳۔ ادارہ امارت کی تشکیل کے لئے ملک میں ایسی حلقہ بندیاں کی جائیں گی کہ ہر حلقہ کی بالغ آبادی اپنے میں سے بہترین افراد کو صوبائی اور مرکزی مجالسِ مشاورت (اسمبلیوں) کیلئے تجویز کرے گی۔ ہر صف میں جس فرد کو اکثریت کی حمایت حاصل ہوگی وہ صوبائی و مرکزی (ایسا انتخاب ہر مجلس کے لئے جداگانہ ہوگا) مجلس مشاورت کا رکن متصور ہوگا۔

۴۔ صوبائی اور مرکزی مجلس مشاورت ایسے افراد پر مشتمل ہوں گی۔

۵۔ امیرِ ملت کا انتخاب مرکزی مجلسِ مشاورت اپنے میں سے باہر ملّت سے کرے گی۔

۶۔ صوبوں کے مدارالمہام (گورنروں) کا انتخاب امیرِ ملت مجالسِ مشاورت سے باہر ملت سے کریگا۔

۷۔ مرکزی وزراء کا انتخاب امیرِ ملّت، مرکزی مجلسِ مشاورت سے کرے گا اور صوبوں کے وزراء کا انتخاب صوبوں کے گورنر اپنی اپنی مجلسِ مشاورت سے کریں گے۔

۸۔ ملی میزانیہ (بجٹ) کو مرکزی مجلسِ مشاورت منظور کرنے کے لئے امیرِ ملت کے پیش کرے گی اور امیر ملت اس کو منظور کرنے اور اس میں مفید ترمیم یا اصلاح تجویز کرنے کا مجاز ہوگا۔ صوبوں میں صوبائی مجلسِ مشاورت اور گورنروں کے مابین صوبائی میزانیوں کے بارے میں بھی یہی طریق کار ہوگا۔

۹۔ امیرِ ملت مرکزی مجلسِ مشاورت کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اور اس کو یہ مجلس دو تہائی ووٹوں کر برطرف کر کے اس کی جگہ شق عث کے مطابق نیا امیر منتخب کر سکے گی۔

(۱۰) گورنر امیرِ ملت کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور وہی اُن کو مرکزی مجلس مشاورت کے مشورے سے برطرف کرنے کا مجاز ہوگا۔

۱۱۔ سارے ملک میں واحد قانون کا چلن ہوگا۔ اور سارے ملک کے لئے مرکزی مجلسِ مشاورت واحد قانون ساز ادارہ ہوگی۔ ملکی قانون قرآنی اصولوں پر مبنی ہوگا جسے مرکزی مجلسِ مشاورت امیرِ ملت کی منظوری سے رائج کریگی۔

اس لائحہ عمل سے ملت میں اتحاد و اتفاق رہے گا۔ نہ کسی فرد کے دل میں کدورت پیدا ہوگی اور نہ پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوگا۔ یہ لائحہ عمل (جو محض ایک بنیادی ڈھانچہ ہے) قرآنی نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کی روشنی میں اہلِ فکر و نظر کے غور کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مزید گفت و شنید کی کافی گنجائش ہے مگر اتنا عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ جب تک ان بنیادی حقائق کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے گا جو اس مقالے میں بیان کیے گئے۔ اس وقت تک ملی یکجہتی کا حصول مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا!

طلوعِ اسلام

اس مقالہ کے آخر میں جو پروگرام دیا گیا ہے اس کا تعلق درحقیقت طریقِ کار سے ہے جس میں مختلف آراء بھی ہوسکتی ہیں اور عندالضرورت تبدل و تغیر کا امکان بھی۔ اصل چیز قرآن کے اصولِ امارت و معیشت و معاشرت ہیں۔ اگر انہیں تسلیم کر کے آئین کی بنیاد بنا دیا جائے تو پھر طریقِ کار کی جزئیات میں ردّ و بدل سے بھی ملت کی یکجہتی میں فرق نہیں آسکتا۔ ملت میں یکجہتی پیدا کرنے کا طریق ہی یہ ہے کہ ہم اپنے فکر و عمل کا مرکز قرآن کریم کو قرار دیں۔

(ذکی الدین انقیم)

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن
ہر اتوار کی صبح ——— ۸½ بجے ۲۵/بی گلبرگ میں
شروع ہوتا ہے ——— (نمائندہ بزم لاہور)

ایڈیٹر۔ صفدر سلیمی۔ پبلشر۔ سراج الحق ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور۔ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور